اردو کا مقبولِ عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

غالب نمبر

ماگھ شک سمت ۱۸۸۱
فروری سنہ ۱۹۶۰ء

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

ترتیب

سرورق:۔ شبیہہ مرزا غالب
رسالے کی پشت پر۔ تاج محل

سالانہ چندہ:۔ ہندوستان میں۔ چھ روپے / پاکستان میں۔ چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:۔ نو شلنگ یا سوا ڈالر
فی پرچہ:۔ ہندوستان میں۔ ۵۰ نئے پیسے / پاکستان میں۔ آٹھ آنے (پاک)

جلد ۱۸۔ نمبر ۷

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل، اردو، اولڈ سیکرٹریٹ، دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

پچھلے دنوں پیرس میں مغربی ممالک کے سربراہوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ۲۷-اپریل سنہ ۱۹۶۰ء کو پیرس میں چار بڑوں کی کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس فیصلے کے مطابق روس کے وزیر اعظم مسٹر خروشچیف کو دعوت نامہ بھیج دیا گیا، انھوں نے دعوت نامہ منظور کر لیا لیکن کانفرنس کی تاریخ سے اتفاق نہیں کیا۔

اب روس نے مغربی طاقتوں کی یہ تجویز مان لی ہے کہ یہ کانفرنس اس سال ۱۶-مئی کو پیرس میں ہو۔ اس کانفرنس میں عالمی سیاست کے بہت سے مسائل زیر بحث آئیں گے۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ تخفیف اسلحہ اور خاص کر اسلحہ پر کنٹرول اور ہائیڈروجن بموں پر پابندی عائد کرنے کا ہے۔ ہمیں امید کرنا چاہئے کہ عالمی امن اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر یہ سارے مسائل بخیر و خوبی طے پا جائیں گے۔

دلی میں ۱۱-دسمبر سنہ ۱۹۵۹ء کو صدر جمہوریہ نے دنیا کی سب سے بڑی زراعتی نمائش کا افتتاح فرمایا۔ اس عالمی زراعتی میلے کا انتظام بھارت سیوک سماج نے کیا ہے۔ یہ اپنے قسم کا انوکھا میلہ ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے سولہ ملک حصہ لے رہے ہیں، ہندوستان کی ۱۷ ریاستوں نے اپنے اپنے خوبصورت پویلین لگائے ہیں۔ اس نمائش سے ہمارے کسانوں کو بہت فائدہ پہونچے گا، وہ لوگ زرعی ترقی کے جدید ترین طریقوں کا مطالعہ کر سکیں گے جیسا کہ صدر جمہوریہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا، ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے، ہمارے کسانوں کو پُرانے تجربوں پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ سائنسی طریقوں کو اپنا کر نئے ڈھنگ سے اپنی کھیتی کو ترقی دینا چاہیئے۔

صدر جمہوریہ کے ہاتھوں درگاپور میں فولاد کے کارخانے کی پہلی بھٹی کا افتتاح ملک کی صنعتی ترقی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کارخانہ ہندوستان اور برطانیہ کے سرکاری اور غیر سرکاری تعاون سے قائم کیا جا رہا ہے۔ ایسے دو کارخانے بھلائی اور رورکیلا میں پہلے ہی کام شروع کر چکے ہیں۔ فولاد چھوٹی اور بڑی صنعتوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ فولاد کی پیداوار سے ملک کی صنعتی ترقی میں بڑی مدد ملے گی۔

حیدرآباد کا 'دائرۃ المعارف' ایک قدیم علمی ادارہ ہے۔ یہ ادارہ گذشتہ ۷۰ سال سے علوم مشرقیہ کی ترویج و ترقی کے لئے نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کی خدمات کو مشرق و مغرب کے ممتاز علماء اور فضلاء نے سراہا ہے۔ دائرۃ المعارف نے روس، ٹرکی، مصر، شام، عراق، سعودی عرب، ایران اور دیگر ممالک کے مشہور کتب خانوں سے نایاب علمی نسخے حاصل کر کے انھیں شائع کیا۔ ان مطبوعات نے نہ صرف تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے آسانیاں بہم پہنچائیں بلکہ اس طرح مشرق و مغرب کی دیگر قوموں کے ساتھ ہندوستان کے ثقافتی تعلقات کو بھی مضبوط کیا۔ ادارہ اپنی ان خدمات کے لئے ہر طرح کی داد و تحسین اور امداد و تعاون کا مستحق ہے۔

مالک رام

نواب مختار الملک میر تراب علی خاں بہادر سالار جنگ

حضرت اویس قرنیؓ کا نام تاریخِ اسلام میں نادیدہ عاشقِ رسولؐ کی حیثیت سے بہت مشہور و معروف ہے۔ قرن با ختلافِ روایت یمن کے ایک قریہ (تذکرۃ الاولیا) یا ایک قبیلے (روضۃ الصفا) کا نام ہے۔ حضرت اویسؓ اسی سے منسوب تھے۔ ان کی نویں پشت میں ان کے ایک ہم نام اویس ثالث ہوئے۔ یہ مدینہ کے متولیِ اوقاف تھے۔ معلوم نہیں کیوں، وہ اپنے بیٹے محمد علی کو ساتھ لے کر ہندستان چلے آئے۔ یہاں ان دنوں بیجاپور کے تخت پر علی عادل شاہ جلوہ افروز تھا۔ دونوں باپ بیٹے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی خاندانی وجاہت اور علم و فضل کا لحاظ کرتے ہوئے، ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی اور ان کے صاحبزادے شیخ محمد علی کو دبیری کا عہدہ عطا ہوا۔

رفتہ رفتہ اس خاندان نے بہت عروج حاصل کیا۔ شیخ محمد علی کے پڑپوتے شمس الدین محمد حیدر (بن محمد تقی بن محمد باقر بن محمد علی) نظام علی خان، نظام الملک آصف جاہ اول کے عہد میں سلطنتِ دکن کے دیوان مقرر ہوئے۔ حیدر یار خاں بہادر، بشیر جنگ، منیر الدولہ، منیر الملک ان کے خطاب تھے۔ ۴۷ برس ان کی عمر تھی، جب ۱۷۷۵ء میں انتقال کیا۔ تاریخ ہوئی: حیدر یار خانِ عادل۔ ۱۱۸۹ھ۔ اورنگ آباد میں دفن ہوئے۔ اس عہد کی تمام تاریخیں ان کی قابلیت اور اوصافِ حمیدہ کے بیان سے مملو ہیں۔

شمس الدین محمد حیدر کے دو بیٹے تھے ــــ محمد صفدر خاں اور تقی یار خاں۔ تقی یار خاں ۱۷۸۲ء میں لاولد فوت ہوئے۔ بڑے محمد صفدر خاں نے بھی بہت اعزاز و اکرام پایا، مختلف اوقات میں نظام کی طرف سے غیور جنگ بہادر، اشجع الدولہ، اشجع الملک، خان خاناں کے خطابات سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے ۱۷۹۰ء (۱۲۰۴ھ) میں بعارضۂ خفقان انتقال کیا، "حشرِ او می شود با آلِ رسول" (۱۲۰۴) تاریخِ وفات ہے۔ اورنگ آباد میں اپنے والد کے مقبرے ہی میں مدفون ہیں۔ دیگر خوبیوں کے علاوہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔

محمد صفدر خاں کی شادی درگاہ قلی خاں سالار جنگ کی دختر نیک اختر بہجت بیگم سے ہوئی تھی۔ اس سے ان کے چار بیٹے ہوئے۔ محمد تقی خاں، حسن رضا خاں، علی زمان خاں، رضا یار خاں۔ ان میں سے تیسرے بیٹے (علی زمان خاں) کا نکاح ابو القاسم میر عالم وزیر اعظم دکن کی بڑی صاحبزادی نفیس بیگم سے ہوا تھا۔ لیکن جب زچگی میں ان کا انتقال ہو گیا، تو میر عالم نے حضور نظام کے ایما سے اپنی دوسری بیٹی صاحب بیگم ان کے نکاح میں دے دی۔ میر عالم ہی وہ شخص ہیں، جو ٹیپو سلطان شہید کی بربادی کا باعث ہوئے۔ بڑے زیرک اور معاملہ فہم اور کارکن شخص تھے۔ انگریزوں کو ان پر خاص اعتماد تھا۔ حیدر آباد دکن کی متعدد مشہور عمارتیں انہی کی توجہ بلکہ خرچ پر تعمیر ہوئیں۔ بڑے فاضل شخص تھے۔ نظم و نثر پر پوری قدرت حاصل تھی اور صاحبِ تصنیف و تالیف تھے۔

میر عالم کی وفات ۱۸۰۸ء (۱۲۲۳ھ) کے بعد ان کے داماد علی زمان خاں بہادر، منیر الدولہ، منیر الملک ثانی، امیر الامراء ان کی جگہ دیوانِ حیدر آباد مقرر ہوئے۔ لیکن "جو چاہتے ہیں، سو آپ کریں ہیں"

کے مصداق جملہ احکام خود نظام سکندر جاہ بہادر جاری فرماتے اور ریاست کے مالی معاملات میں سیاہ و سپید کے کرتا دھرتا پیشکار مہاراجہ چندو لال بہادر تھے۔ اس لیے ان کی دیوانی محض برائے نام اور گویا انھیں "بدنام" کرنے کا ایک حیلہ بن کے رہ گئی تھی۔ بہرحال یہ ۲۵ برس تک وزیر ریاست رہ کر ۱۸۳۳ء (۱۲۴۸ھ) میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اس کے بعد مہاراجہ چندو لال ہی کو ریاست کی مستقل مدار المہامی کا عہدہ بھی تفویض ہو گیا، جس پر وہ گیارہ برس، ۱۸۴۳ء تک فائز رہے۔ معزولی کے بعد ۱۸۴۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

نواب علی زمان خاں منیر الملک ثانی کے اس دوسرے نکاح سے دو بیٹے پیدا ہوئے تھے ـــــ میر محمد علی خاں اور میر عالم علی خاں۔ یہی میر محمد علی خاں ہمارے نواب مختار الملک سالار جنگ کے والد ماجد ہیں۔

میر محمد علی خاں ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ تاریخِ ولادت سید مرزا خاں نے کہی تھی: "ستارۂ روشن"۔ ان کی مہر کا سجع تھا: بود جانشینِ محمد علی۔ خطاب شجاع الدولہ، سالار جنگ تھا۔ ان کا نکاح امیرِ سلطنت سید کاظم علی خاں مختار الدولہ کی صبیہ زینت النساء بیگم سے ہوا تھا، جو سادات نیشاپور میں سے تھے۔ اسی محل سے ان کے ۲ جنوری ۱۸۲۹ء (۲۵ جمادی الثانی ۱۲۴۴ھ) کو وہ بیٹا پیدا ہوا، جو آگے چل کر اس سلسلۂ زرناب کے لیے بھی باعثِ صد فخر و مباہات ثابت ہوا۔ والدین نے اس کا نام تراب علی خاں رکھا۔ خاندان کا دستور یہ تھا کہ نومولود کو سب سے پہلے تبرکاً کسی عابدہ، زاہدہ بی بی کا دودھ پلواتے تھے۔ یہ پیدا ہوئے، تو انھیں ریاست کے ایک معزز منصب دار میر چراغ علی خاں کی بیگم کا، جو بہ صفت موصوف خاتون تھیں، دودھ پلایا گیا۔ اسی لیے میر چراغ علی خاں کے صاحبزادے، میر تہور علی خاں مختار جنگ، جلال الدولہ اور نواب میر سالار جنگ دونوں کی ایک ساتھ پرورش ہوئی اور وہ ان کے رضاعی بھائی ہونے کے باعث ان کے کوکہ کہلاتے تھے۔

میر محمد علی خاں کا عین شباب میں بعمر ۲۵ برس ۱۸۳۲ء (۱۲۴۷ھ) میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد تراب علی خاں کی پرورش ان کے جدِ بزرگوار نواب منیر الملک ثانی نے اپنے ذمے لی، جو ان سے دیوانہ وار محبت کرتے تھے۔ یہ چار برس کے تھے کہ انھیں ایسا شدید تپ کا عارضہ لاحق ہو گیا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ روایت ہے کہ جب سب کو یاس ہو گئی تو نواب منیر الملک نے دعا مانگی کہ بارِ الٰہا! اگر اس بچے کی موت مقدر ہی ہے، تو اس کی جگہ مجھے اٹھا لے اور اسے صحت عطا فرما دے۔ جانے وہ کون سی گھڑی تھی، جب یہ لفظ ان کے منہ سے نکلے۔ دعا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہو گئی۔ چند دن میں بچہ بھلا چنگا ہو گیا اور نواب منیر الملک ثانی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ہونے کو یہ ٹھیک تو ہو گئے، لیکن بیماری کا حملہ اتنا شدید تھا کہ اس سے تندرستی بالکل تباہ ہو گئی اور یہ دائمی طور پر نحیف الجثہ اور منحنی ہو کے رہ گئے۔

منیر الملک کی وفات کے بعد ان کی تعلیم و تربیت، ان کے چچا میر عالم علی خاں بہادر سراج الملک کی نگرانی میں ہونے لگی۔ چونکہ صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور اندیشہ تھا کہ مزید لکھنے پڑھنے سے یہ اور خراب ہو جائے گی، اس لیے ایک زمانے تک ان کی باقاعدہ تعلیم شروع نہ ہو سکی اور یہ گیارہ بارہ برس کی عمر تک معمولی شُد بُد سے آگے نہیں بڑھے۔ اس کے بعد جب کچھ اچھے ہوئے تو اس پر زیادہ سنجیدگی سے توجہ دی گئی اور انھوں نے اس زمانے کے رواج کے مطابق فارسی اور عربی، حساب کتاب، انشا پردازی اور خوش نویسی کی معقول تعلیم کے علاوہ مردانہ کھیلوں میں بھی خاصی مہارت حاصل کی۔ چنانچہ نشانہ لگانے اور نیزہ بازی اور شہ سواری میں پورے طاق تھے۔ خاص طور پر گھوڑے کی سواری کے بہت شائق تھے۔ بڑے سے بڑے منہ زور گھوڑے پر بے دھڑک سوار ہو جاتے۔ زمانۂ شباب میں انگریزی حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا تو رفتہ رفتہ اس سے بھی بقدرِ ضرورت اچھی خاصی واقفیت پیدا کر لی تھی۔

نواب منیر الملک نے وفات کے وقت پچیس لاکھ قرض چھوڑا تھا۔ غفران منزل نواب ناصر الدولہ بہادر آصف جاہ چہارم نے قرضہ تو بے باق کر دیا لیکن ان کی بیشتر متروکہ جائداد نزول قرار دے دی۔ اس سے خاندان پر گویا عسیر الحالی کا دور آ گیا۔ نواب سراج الملک اگرچہ اپنے والد کی جگہ مدار المہام ریاست تو ہو گئے، لیکن ان کی آمدنی اتنی قلیل تھی کہ ان کے مرتبے کے مطابق داد و دہش کے لیے کفایت نہیں کرتی تھی۔ لامحالہ

انھیں قرض لینا پڑتا تھا۔ لیکن ساہوکار جانتے تھے کہ اس کی واپسی کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں، اس لئے وہ کافی ضمانت کے بغیر قرض دینے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ لطیفہ یہ کہ وہ بالعموم مطالبہ کرتے کہ اگر آپ کے بھتیجے میر تراب علی خاں ضامن ہو جائیں تو ہم قرض دے دیتے ہیں۔ میر تراب علی خاں اس کم سنی کے باوجود حساب کتاب کے معاملات میں بہت ہوشیار تھے۔ جب نواب سراج الملک ان سے کہتے کہ تم ضمانت دے دو، تو یہ عرض کرتے: خاکسار کو بھلا اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے، لیکن میری التماس یہ ہے کہ جاگیر میں سے کسی علاقے کا انتظام میری تحویل کر دیا جائے، تاکہ میں اس کی آمدنی سے قرضے کی ادائی کا انتظام کر سکوں۔ اس سے دو فایدے ہوئے۔ اول یہ کہ بہت سا قرض بتدریج ادا ہوتا گیا۔ ورنہ وہی صورت ہوتی، جو نواب منیر الملک کی وفات پر پیش آئی تھی۔ دوسرے انھیں چھوٹی سی عمر ہی میں مالی اور انتظامی معاملات کا غیر معمولی تجربہ حاصل ہو گیا۔

۱۸۴۸ء میں جب نظام نے نواب سراج الملک کو دوبارہ وزارت اعلیٰ پر مقرر فرمایا۔ تو ان کی خاندانی جایداد بھی واگذاشت کر دی۔ میر تراب علی خاں نے اپنے حسن انتظام سے پہلی جاگیر کی دیکھ بھال ایسی عمدگی سے کی تھی کہ چچا دل و جان سے ان کی قابلیت اور کارکردگی کے قایل ہو گئے تھے۔ اب جو انھیں ساری جایداد واپس ملی، تو انھوں نے اسے بھی اپنے ہونہار بھتیجے کے ہاتھ میں دے دیا۔

نواب سراج الملک نے چند دن کی علالت کے بعد ۲ مئی ۱۸۵۳ء (۲۷ شعبان ۱۲۶۹ھ) کو لاولد انتقال کیا۔ اس کے پانچ دن بعد نواب ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم نے میر تراب علی خاں کو طلب کیا اور انگریز ریذیڈنٹ کی موجودگی میں، انھیں خلعت دیوانی اور سالار جنگ کے خطاب سے مفتخر فرما کر اپنا مدار المہام یعنی وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف چوبیس (۲۴) برس کی تھی۔ میرزا ہمدم شیرازی کے طویل قطعہ تاریخ کے آخری چند شعر ہیں ؎

فلک رتبہ نواب سالار جنگ ۔۔۔ تراب علی، نور چشم جہاں
شہ باستاں میر احمد لوا ۔۔۔ سر راستاں آصف جم نشاں
وزیر خرد مند دانش پذیر ۔۔۔ جوان جواں بخت روشن رواں
بجا سے نیاگاں بہ مسند نشست ۔۔۔ بہ تدبیر پیر و بہ بخت جواں
پے سال تاریخ ہمدم بگفت ۔۔۔ "وزارت مبارک بہ صدر جہاں"

۱۲۶۹

جب یہ مدار المہام ہوئے ہیں، تو اس وقت یہاں کی حالت کس درجہ ابتر تھی، اس کا اندازہ صرف اس سے لگایئے کہ ریاست پر دو کروڑ ستر لاکھ کا سودی قرض تھا۔ اس کے علاوہ عرب جمعداروں کے پاس ریاست کی نصف سالانہ آمدنی (یعنی ۷۵ لاکھ) کا علاقہ رہن تھا، اور کوئی پندرہ بیس لاکھ سالانہ کی جاگیریں بھی انہی جمعداروں کے مستقل قبضے میں تھیں اور مزید کم و بیش تیس لاکھ کے علاقے ٹھیکے پر تھے۔ غرض خزانہ خالی تھا اور روز بروز قرض کی مقدار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ فوج اور سپاہ کو مہینوں تنخواہ کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ جب یہ لوگ سخت تنگ آ جاتے تو "بجنگ آمد" پر عمل کرتے ہوئے شاہی محل پر ہلّہ بول دیتے، فساد پر آمادہ ہو جاتے اور بغاوت کی دھمکی دیتے۔ لامحالہ اس پر مزید قرض لے کر دو ایک مہینے کی باقی ادا کر دی جاتی تا آنکہ یہ لوگ پھر مرنے مارنے پر تیار نہ ہو جاتے۔

مالی بدحالی کا یہ حال تھا۔ رہا انتظام حکومت تو وہ اس سے بھی بدتر تھا۔ ریاست میں عرب جمعداروں اور روہیلے پٹھانوں کا دور دورہ تھا۔ ان کی شورہ پشتی اور رعایا پر ظلم و ستم کے ایسے ایسے واقعات لکھے ہیں کہ انھیں پڑھ پڑھ کے حیرت ہوتی ہے۔ ایک عرب نے راہ چلتے ایک شریف آدمی سے کہا کہ صاحب، ذرا یہ دستاویز تو پڑھ دیجیے۔ اس نے دیکھ کر کہا کہ یہ چار سو روپیے کا تمسک ہے۔ عرب نے بگڑ کے کہا: واہ، خوب آدمی ہے، پانسو کے تمسک کو چار سو کا بتاتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اس میں تو چار سو ہی لکھا ہے۔ اگر اعتبار نہیں، تو کسی اور سے پڑھوا لو۔ اس پر عرب نے غیظ و غضب سے کاغذ اس کے ہاتھ سے چھین پھاڑ کے پھینک دیا اور اس غریب کے گلے میں رومال ڈال کے کہنے لگا: اچھا چلو اس وقت چار سو ہی ادا کر دو، بقیہ کی پھر دیکھی جائے گی۔ اب تو وہ شخص چیخنے لگا کہ میں نے کب تم سے کچھ لیا ہے۔ لیکن کون سنتا ہے، وہ عرب اسے کھینچ کے ساتھ لے چلا۔ آخر بڑی مشکل سے کچھ دے دلا کر گلو خلاصی کرائی۔ ان کے ظلم کا ایک اور افسوس ناک واقعہ سنیے۔

احمد علی خاں شہیدؔ تخلص منصب دارِ ریاست تھے۔ ان کی ایک نابالغ بیٹی تھی۔ عربوں کے جمعدار ناصر رستم جنگ نے اپنے بھتیجے کے لیے شہیدؔ سے اس لڑکی کی خواستگاری کی۔ شہیدؔ نے کسی وجہ سے انکار کر دیا زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک شام ان کے دروازے پہ ایک فقیر نے آ کے سوال کیا۔ اتفاق سے اس وقت ان کی بیوی اور اس معصوم لڑکی کے سوائے گھر پر کوئی نہیں تھا۔ ماں نے بیٹی سے کہا کہ جاؤ، فقیر کو کوڑی دے آؤ۔ جب دیر تک لڑکی واپس نہ آئی، تو ماں پکارتی ہوئی دوڑی۔ دیکھا تو لڑکی غائب ہو گئی ہے۔ بہت چیخی چلّائی، لیکن بے سود ___! اگلی صبح شہیدؔ غریب نے مکان کا دروازہ کھولا، تو دیکھا کہ سامنے گلی میں ایک گٹھڑی پڑی ہے۔ اسے کھولا، تو اس میں سے دخترِ گم شدہ کی لاش کے ٹکڑے ملے۔ کوتوالی گئے، فریاد کی، لیکن اب کیا ہوتا تھا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔

روہیلے پٹھان بھی ان عربوں سے کم نہیں تھے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے پیر سلطان میاں کو مہدیِ زماں مانتے تھے، اس لیے مہدوی کہلاتے تھے۔ ان کے تمرّد اور سرکشی کا اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ ایک دن ان کے پیرزادے کی سواری، جن کا نام محمّد تھا، حسبِ معمول بڑی دھوم دھام سے بازار میں جا رہی تھی۔ بلّم برداروں اور بھالے داروں کا ایک گروہ ان کے جلو میں، ہٹو بچو کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دوسری طرف سے حضور نظام کے پیش امام مولوی مرتضیٰ کے بھتیجے گھوڑے پر سوار آ رہے تھے۔ اس شور و شغب سے ان کا گھوڑا چمکا اور کارِ قضا اس کے پاؤں سے کیچڑ کا ذرا سا چھینٹا اڑ کر پیرزادے صاحب کے دامن پر آ پڑا۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ ان کے اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ ایک بلّم بردار نے بلّم کی نوک سے مولوی زادے کی پگڑی اُچھال کے زمین پر پھینک دی۔ یہ غیرت اور غصّے کے مارے بے حال ہو گئے، اور ساتھ کے خدمت گار سے تلوار لینے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دوسرے نے تلوار کا ہاتھ مارا۔ جس سے ان کی چاروں انگلیاں کٹ کے الگ ہو گئیں۔ پھر کیا تھا پیرزادے کے ہمراہی ان پر ٹوٹ پڑے اور تلوار، کٹار، بھالے سے ان کے پرزے اڑا دیے۔ دارالخلافے میں، دن دہاڑے، عین سرِ بازار یہ حادثہ پیش آیا اور کوئی ان ظالموں کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔

ہر ایک رئیس نے جمعیت اکٹھا کر رکھی تھی۔ یہ لوگ رعایا پر ظلم و تعدّی کرتے اور ان سے جو چاہتے، وصول کر لیتے۔ اگر کوئی انکار کرتا تو اسے کھلے بندوں موت کے گھاٹ اُتار دیتے۔ پھر اُن کی آپس میں خانہ جنگیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔

غرض ریاست کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اندرونی طور پر کامل خلفشار کا عالم تھا اور باہر نہ اس کی کوئی عزّت تھی نہ وقار۔

سالار جنگ نے زمامِ وزارت ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے ریاست کی مالی حالت کی اصلاح پر توجہ دی کہ دراصل یہی جملہ خرابیوں کی جڑ تھی۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ جن لوگوں کے پاس پشت ہا پشت سے اتنی بڑی بڑی جاگیریں چلی آ رہی تھیں، جن کی لاکھوں کی آمدنی سے اُن کی حیثیت گویا خود مختار رئیس کی ہو گئی تھی، وہ بھلا کیوں اس سے دست بردار ہونے لگے تھے۔ لیکن سالار جنگ نے بہت صبر اور دور اندیشی اور حکمتِ عملی سے کام لیا۔ کہیں نرمی سے جاگیردار کو رام کیا اور کہیں ضرورت پڑنے پر سختی سے کام نکالا۔ یوں تیرہ برس کے عرصے میں ریاست کا تمام قرض بھی ادا کر دیا، مرہونہ علاقے بھی واگزار ہو گئے، فسادی عناصر کا بھی قلع قمع ہو گیا، اور وہی ریاست جس کی نہ گھر میں کوئی ساکھ تھی، نہ باہر پوچھ، اب ہندستان کی سب سے طاقتور ریاست شمار ہونے لگی۔

ان سے پہلے ریاستی کاروبار میں کسی نظم و ترتیب کا پتا ہی نہیں تھا۔ سب کچھ نظام اور ان کے مدار المہام کی ذاتی رائے پر موقوف تھا۔ اب ریاست کے تمام محکمے سالار جنگ بہادر کی توجہ اور بیدار مغزی سے عالمِ وجود میں آئے۔ سب سے پہلے خزانۂ عامرہ قایم ہوا پھر لوگوں کو تنخواہ باقاعدگی سے مہینے کے مہینے ملنے لگی۔ اس کے بعد انھوں نے کاروبارِ ریاست کو چار انتظامی شعبوں میں تقسیم کر کے انھیں چار امیروں کے سپرد کیا، جن کی حیثیت گویا وزیروں کی تھی۔ یہ صدر المہام کہلاتے تھے۔ اس طرح گویا ایک کابینہ مرتب ہو گئی۔ غرض ان کے عہد میں یہ سب کام کاج ایک مہذّب اور متمدّن نظام کے مطابق ہونے لگا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب کچھ بے غل و غش آسانی سے ہو گیا۔ صرف حاسدوں اور فتنہ پردازوں ہی نے قدم قدم پر روڑے اٹکائے ہوتے، تو اس سے تعجب نہ ہوتا، کیونکہ ان کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ انھیں بدنام کریں اور

ناکام بنا دیں۔ سب سے بڑی مشکل خود غفران منزل نواب ناصر الدولہ کی
تھی۔ سالار جنگ مرحوم جی جان سے چاہتے تھے کہ نہ صرف ریاست میں
انگریزی طرزِ حکومت ہی رائج کیا جائے بلکہ خود انگریزوں سے بھی پورا
ربط ضبط اور دوستی کا رشتہ قایم ہو جائے۔ انھیں اس کا پوری دیانتداری
سے یقین تھا کہ اسی میں ریاست کی بھلائی ہے۔ دوسری طرف نواب ناصر الدولہ
سخت دیندار قسم کے انسان تھے۔ وہ انگریز اور انگریزی قانون اور انتظام
کے نام تک سے بھڑکتے اور برہم ہوتے تھے۔ جب حکمران کے یہ خیالات ہوں
تو وزیر کی حالت قابلِ رحم کیوں نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سالار جنگ
کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ لیکن وہ کسی حال میں بھی مایوس نہیں
ہوئے۔ پورے استقلال اور وقار سے اپنی حکمت عملی پر قایم رہے اور بتدریج
ریاست میں اصلاحات کا نفاذ کرتے رہے۔

غفران منزل نواب ناصر الدولہ کا ۱۸۵۷ء میں انتقال ہو گیا۔
بسترِ مرگ پر انھوں نے اپنے وارث نواب افضل الدولہ (آصف جاہ پنجم)
اور وزیر نواب سالار جنگ کو وصیت کی کہ حکومت انگریزی کا برتاؤ ہماری
ریاست سے ہمیشہ دوستانہ رہا ہے، اس لیے تمھارا فرض ہے کہ تم بھی اس
سے وفاداری کا تعلق رکھو۔ جس دن نواب افضل الدولہ گدی پر بیٹھے ہیں،
اس دن دلّی سے اس ہنگامے کے شروع ہونے کی خبر حیدرآباد پہنچی، جس
نے آہستہ آہستہ پھیل کر پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر ان دونوں
نے جس طرح مرحوم کی آخری نصیحت پر عمل کیا، وہ ان کے کردار کی
بلندی پر دال ہے۔ انھیں ہر طرح کی دھمکیاں دی گئیں بلکہ دھمکیوں سے
گزر کر ان پر واقعی قاتلانہ حملے ہوئے، لیکن ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ جو
راستہ انھوں نے اختیار کیا تھا، اس پر بے خوفی اور مضبوطی سے
قایم رہے۔

نواب افضل الدولہ نے تخت نشین ہوتے ہی انھیں خطابِ مختار الملک
سے سرفراز فرمایا۔ میر احمد علی خاں شہید نے تاریخ کہی ؎

بہ نوابِ سالار جنگ اہلِ حشمت — خطاب و جواہر سزاوار دادا
بہ دل داشتم، فکرِ سالِ ہمایوں — خرد گفت: "جاوید مختار بادا"
(۱۲۷۳ھ)

نواب افضل الدولہ کے عہد میں بھی پورا زمانہ یہی مدار المہام رہے۔ خوش اعتقادی
اور دینداری میں یہ بھی اپنے والد مرحوم نواب غفران منزل سے کم نہیں تھے۔
اسی لیے ان کی نئی نئی جدتوں سے اکثر جز بز ہوتے، بلکہ معاندوں کی
ریشہ دوانیوں کے باعث برافروختہ اور ناراض تک ہوتے رہتے تھے
لیکن انھیں بھی ان کی وفاداری اور خیرخواہی پر کامل اعتماد تھا۔ اور سالار جنگ
نے بھی اپنی جاں فشانی اور اخلاص سے دن رات محنت کرکے ریاست کو
چار چاند لگا دیے۔ ۱۸۵۷ء میں ریاست نے جو رویہ اختیار کیا تھا
اس سے انگریزی حکومت ان کی دوستی کی قایل ہو گئی تھی۔ چناں چہ
جب ہر طرف امن و امان ہو گیا اور ملک کے سب حصّوں پر انگریزی
تسلط از سرِ نو قایم ہو گیا، تو ۱۸۶۰ء میں انگریزوں نے اظہارِ خوشنودی
کے طور پر نواب افضل الدولہ کے لیے ایک لاکھ روپے کے اور مختار الملک
کے لیے بتیس ہزار کے تحائف ارسال کیے۔ اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں
مختار الملک کو "سر" کا خطاب بھی دیا، پھر ۱۸۷۱ء میں نائٹ گرانڈ کمانڈر
آف دی آرڈر آف سٹار آف انڈیا G. C. S. I. کا خطاب
اور ۱۸۷۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی پر اکیس توپ کی سلامی کا ذاتی اعزاز
ملا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سلطان عبدالحمید خلیفۃ المسلمین نے بھی
تمغۂ مجیدی درجہ اوّل عطا کیا۔

مغفرت مکان نواب افضل الدولہ کا ۱۸۶۹ء میں انتقال ہو گیا
اور ان کے ڈھائی سالہ صاحبزادے میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم
ان کے جانشین ہوئے۔ اب مختار الملک کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئیں۔
سرکار انگریزی نے ان کے ساتھ نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر کو شریک
ریجنٹ مقرر کیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نواب شمس الامرا نے کبھی ان کے
کام پر اعتراض نہیں کیا۔ اور یہ ہر معاملے میں اپنی صواب دید ہی سے
فیصلہ کر دیتے تھے۔ جب نواب شمس الامرا کا اپریل ۱۸۷۷ء میں انتقال
ہو گیا، تو ان کی جگہ نواب رشید الدین خاں وقار الامرا شریک ریجنٹ
مقرر ہوئے۔ چار برس بعد دسمبر ۱۸۸۱ء میں وہ بھی اللہ کو پیارے
ہو گئے، تو اب ان کی جگہ کسی اور کو مقرر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں
کی گئی۔ اب گویا "مختار الملک" اسم بامسمیٰ ہو گئے۔

شروع میں برار کا علاقہ دراصل ریاست حیدرآباد ہی کا حصّہ
تھا۔ ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے اسے انگریزی فوج متعینہ ریاست
کی بقایا تنخواہ کے عوض میں اپنی تحویل میں لے لیا۔ مختار الملک نے

مدارالمہام مقرر ہوتے ہی اس انتظام کی خرابی محسوس کر لی تھی، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ جب تک ریاست کی مالی حالت خستہ رہی، اس کی واپسی کی کوشش بھی بے سود تھی۔ جب انھوں نے اپنی مسلسل مساعی اور اصلاحات سے ریاست کو پھر سے اپنے پاؤں پہ کھڑا کر دیا اور انگریزوں پر بھی ثابت ہو گیا کہ حیدرآباد کا نظم و نسق کسی دوسری جگہ سے کم نہیں، تو انھوں نے استردادِ برار کی کوشش شروع کی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو ہندستان میں جن خطرناک حالات کا سامنا تھا، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ان ایام میں بھی نواب مختارالملک نے سخت مخالفانہ صورتِ حال کے باوجود پوری وفاداری اور ثابت قدمی سے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ انھیں توقع تھی کہ انگریز ان کی خدمات کے اعتراف میں برار واپس کر دیں گے۔ لیکن چونکہ اس قضیے کا فیصلہ بہر حال ولایت میں ہونا تھا اور ہندستان کے حکام محض وہاں کے احکام نافذ کرنے والے تھے، اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ انگلستان کا سفر کیا جائے اور ذاتی گفت و شنود سے یہ معاملہ طے کرایا جائے۔ حسنِ اتفاق سے ۱۸۷۵ء میں پرنس آف ویلز (جو بعد میں ایڈورڈ ہفتم کے نام سے ملکہ وکٹوریہ کے جانشین ہوئے) ہندستان کی سیر کو آئے۔ ان کے حاشیہ میں ڈیوک آف سدرلینڈ بھی تھے۔ وہ سیر کے لئے جنوری ۱۸۷۶ء میں حیدرآباد پہنچے اور یہاں نواب مختارالملک کی ملاقات سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے روانگی سے پہلے انھیں انگلستان آنے اور اپنے ہاں مہمان بننے کی دعوت دی۔ یہ تو پہلے ہی سے اس سفر کے لیے پر تول رہے تھے۔ اس دعوت نے گویا سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام دیا چنانچہ وہ ۸۔ اپریل ۱۸۷۶ء کو (۵۲) آدمیوں کے قافلے کے ساتھ بمبئی سے جہاز پہ سوار ہوئے۔ رستے میں وہ روما میں شاہ وکٹر عمانویل بادشاہِ اطالیہ اور پوپ سے ملے اور اس کے بعد اطالیہ کے بعض دوسرے شہروں کی سیر کرتے ہوئے ۱۳۔ مئی کو پیرس پہنچے۔ ارادہ یہ تھا کہ یہاں صرف ایک دن رک کر آگے روانہ ہو جائیں گے، جہاں کا مفصل پروگرام پہلے سے بن چکا تھا۔ لیکن پیرس میں ایک افسوس ناک حادثہ پیش آیا جس سے سارا انتظام تلپٹ ہو گیا۔ جس دن یہ یہاں پہنچے ہیں، اسی شام کو اپنی قیام گاہ گرانڈ ہوٹل کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ان کا پاؤں پھسل گیا، جس سے ہڈی ٹوٹ گئی۔ ان کی بے بسی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ چلنے پھرنے تک سے معذور تھے۔ اس حالت میں سفر کیونکر ہو سکتا تھا۔ غرض انھیں علاج کے لیے مجبوراً دو ہفتے یہاں رکنا پڑا۔ جب قدرے افاقہ ہوا اور وہ سفر کے قابل ہوئے تو یکم جون کو ایک خاص بحری جہاز پر سوار ہو کر ولایت پہنچے۔ یہاں ان کی جتنی خاطر مدارات اور اعزاز و اکرام ہوا، اس کا تفصیلی ذکر غیر ضروری ہے۔ ہر جگہ جلسے اور دعوتیں ہوئیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر آف سول لا D. C. L. کی اعزازی ڈگری ملی۔ لندن کی کاؤنٹی کونسل نے ایک خاص اجلاس میں انھیں آزاد شہری Freedom of the city of London کا اعزاز دیا۔ خود ملکہ وکٹوریہ نے ایک دن ونڈسر محل میں مہمان رکھا۔ بے شک یہ سب کچھ تو ہوا، لیکن جس مقصد کے لئے انھوں نے اتنا دور دراز کا سفر اور بے شمار خرچ گوارا کیا تھا اس میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ نہ صرف یہ، بلکہ اس سے متعلق کوئی گفتگو تک نہ ہو سکی۔ جب انھوں نے وزیر اعظم انگلستان سے ملاقات کے لیے وقت مقرر کرنے کی درخواست کی، تو جواب ملا کہ ہم بہت مسرت سے ملیں گے، لیکن برار کے مسئلے پر کوئی بات چیت نہ کی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ حکومت انگریزی کی اس سرد مہری اور بے رخی سے نواب مختارالملک کے دل کو سخت صدمہ پہنچا اور وہ اپنے مقصد میں اس ناکامی کو کبھی نہیں بھولے۔ یہ قافلہ بحسن و خوبی ۲۴۔ اگست کو واپس بمبئی اور اگلے دن ۲۵۔ اگست کو حیدرآباد پہنچا۔

فروری ۱۸۸۳ء میں ڈیوک آف مکلنبرگ حیدرآباد تشریف لائے۔ یہ ولایت کے شاہی خاندان کے فرد تھے اور وہاں کے سفر کے زمانے سے نواب صاحب موصوف کے ان سے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ نواب مختارالملک کا ارادہ تھا کہ ۸۔ فروری کو بڑے وسیع پیمانے پہ ان کے اعزاز میں پُر تکلف دعوت دیں۔ سوءِ اتفاق سے اس سے دو ایک دن پہلے نواب افضل الدولہ مغفرت مکان کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ یہ نواب شمس الامرا مرحوم کی بیگم تھیں۔ اس پہ وہ دھوم دھامی دعوت منسوخ کرنا پڑی اور فیصلہ ہوا کہ اس کی جگہ صرف ساٹھ آدمیوں کی ایک مختصر سی دعوت دی جائے۔ لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔ سات کی شام کو وہ حسبِ معمول بہت رات گئے تک اپنے فرائض منصبی کی

دیکھ بھال میں مشغول رہے۔ دو بجے شب کو یکایک طبیعت خراب ہو گئی۔ اطبا نے تشخیص کی کہ ہیضہ کا حملہ ہوا ہے، لیکن کسی نے معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں کیا اور سب اپنے اپنے کام کاج میں مشغول رہے یہاں تک کہ دونوں صاحبزادے بھی صبح کے وقت باریاب ہو کر پروگرام کے مطابق مہمانِ معظم کے ساتھ شکار پر روانہ ہو گئے۔ پہلے اپنے ذاتی معالج کا علاج رہا۔ اس کے بعد حیدرآباد کے مشہور طبیب میرزا علی سے رجوع کیا گیا، لیکن مرض میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی اور ان کی حالت رفتہ رفتہ بد سے بدتر ہوتی گئی۔ سہ پہر کو دو بجے کے لگ بھگ مسٹر جونس W B. Jones انگریز ریذیڈنٹ عیادت کے لئے آیا۔ اس نے واپس جاکر ریذیڈنسی کے ڈاکٹر بوماں Beaumont کو دیکھنے کے لیے بھیجا۔ لیکن وقت آ لگا تھا۔ قے اور اسہال کی کثرت سے سخت نڈھال ہو گئے تھے۔ دوا اور دعا سب بے کار ثابت ہوئیں۔ القصہ پورے تیس برس تک اپنے ملک اور مالک کی نیک طینتی اور دیانت، دانائی اور بیدار مغزی کے ساتھ خدمت کرنے کے بعد ۸۔ مئی جمعرات کی شام کے ساڑھے سات بجے جاں بحق ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ تاریخِ وفات کا مصرع ہے ع

گم بشد معدنِ فطرت ز دکن

ایک دوسری تاریخ 'جنازہ وزیرِ اعظم' میں بہت حضرات کو توارد ہوا۔

جنازہ جمعے کے دن ۹۔ مئی کو اٹھا۔ حیدرآباد کے مشرقی حصے میں تالاب میر جملہ کے قریب دایرہ میر مومن میں محوِ خوابِ ابدی ہیں، جہاں اس زمانے میں یہاں کے شیعہ اصحاب دفن ہوا کرتے تھے۔ خاندانِ مختار الملک کے مدافن اسی دایرے میں ایک الگ چار دیواری میں ہیں۔ مختار الملک کی قبر اندر چبوترے کی سیدھی جانب واقع ہے۔

نواب مختار الملک کا نکاح ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں نواب میر غلام حسین خاں فخر الملک بہادر کی صاحبزادی حیات النسا بیگم سے ہوا تھا۔ شادی کے بعد شوہرِ نامدار کے گھر میں ان کا عزیز النسا بیگم نام اور دولھن پادشاہ خطاب قرار پایا۔ نواب صاحب کی وفات کے وقت ان کی مندرجہ ذیل اولاد موجود تھی :-

دو بیٹیاں نور النسا بیگم عرف بڑی صاحبزادی اور سلطان بخت افروز بیگم عرف چھوٹی صاحبزادی۔

دو بیٹے تھے، میر لائق علی خاں۔ ولادت ۱۲۔ نومبر ۱۸۶۲ء۔ خطابات: سر، سالار جنگ، مختار الملک، عماد السلطنت، کے سی ایس آئی۔ صرف ۲۳ برس کی عمر میں جنوری ۱۸۸۴ء میں مدار المہام دکن ہوئے۔ عین شباب کے عالم میں ۶ جولائی ۱۸۸۹ء کو انتقال کیا۔ میر یوسف علی خاں سالار جنگ انھیں کے اکلوتے بیٹے تھے۔ یہ اپنے والد کی وفات کے وقت صرف ۲۵ دن کے تھے۔ بڑے صاحب ذوق اور ماہرِ فنونِ لطیفہ تھے۔ حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم کا جملہ سامان اور کتب خانہ بیشتر انھی کا جمع کیا ہوا تھا۔ یہ ۱۹۴۹ء میں لاولد فوت ہوئے۔

دوسرے بیٹے نواب مختار الملک کے میر سعادت علی خاں تھے۔ ان کی ولادت اپریل ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ غیور جنگ، شجاع الدولہ، منیر الملک ثالث بہادر ان کے خطاب تھے۔ انھوں نے بھی ۲۷ برس کی عمر میں ۲۷۔ دسمبر ۱۸۸۹ء کو لاولد انتقال کیا۔

از خاندانِ کسریٰ دیگر کسے نماند

(۲)

غالب نے اگست ۱۸۶۰ء (صفر ۱۲۷۷ھ) میں اپنے دیوانِ اردو کا ایک نسخہ، معلوم نہیں کس کی تحریک پر، نواب مختار الملک کی خدمت میں نذر بھیجا۔ ان کی طرف سے تو کوئی جواب نہ ملا، لیکن منشی محمد حبیب اللہ ذکا نے، جو ان کے میر منشی تھے، انھیں ایک خط لکھا، جس میں میرزا سے ان کے دیوانِ فارسی اور مہرِ نیم ماہ کی فرمائش کی تھی۔ غالب نے خیال کیا کہ یہ فرمائش نواب مختار الملک بہادر کے ایما سے ہوئی ہے اور جواب میں لکھا[۳] کہ ماہِ نیم ماہ وجود میں آیا ہی نہیں اور کلیاتِ فارسی کا پہلا ایڈیشن کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔ جو نسخے تھے وہ ۱۸۵۷ء کی رستخیز میں ضائع ہو گئے۔ اس کی دوبارہ اشاعت کی کوشش ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بن گیا، تو مطبوعہ نسخہ حاضرِ خدمت ہوگا اور

---

[۳] کلیاتِ نثرِ فارسی (غالب) ص ۲۶۳ - ۲۶۷

اگر اس کا انتظام نہ ہو سکا تو کاتب سے لکھوا کے قلمی نسخہ بھجوا دوں گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے بعد انھوں نے وہ قصیدہ نواب مختار الملک بہادر کی مدح میں لکھا اور ان کے منشیِ انشا مولوی مویّدالدّین خاں کی وساطت سے ان کی خدمت میں گزرانا، جس کا مطلع ہے ؎

درمدح سخن چناں نگویم ٭ خضر طلعت کہ داستاں نگویم

اور جو کلّیات مطبوعہ میں نمبر ۴۳ پر چھپا ہے۔ غالب بالعموم قصاید خاص اہتمام سے خوشنویس سے افشانی کاغذ پر لکھوا کے ممدوح کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ قصیدہ انھوں نے اپنے قلم سے لکھ کے حیدرآباد بھیجا تھا۔ ان کی اصلی تحریر آج بھی سالار جنگ میوزیم میں دیکھی جا سکتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے، صلۂ ستایش تو درکنار، ممدوح کی طرف سے اس کی رسید تک موصول نہ ہوئی۔ اس پر انھوں نے ایک عرضداشت لکھی جو ان کے کلّیاتِ نثر فارسی میں شامل ہے (ص ۲۴۷-۲۴۸)۔ اس پر بھی صدائے برنخاست۔ اس کے بعد انھوں نے تو خط یکے بعد دیگرے نواب صاحب ممدوح کے نام لکھے۔ لیکن جب کسی کا جواب نہ ملا تو انھوں نے مولوی مویّدالدّین سے استمداد کی (جن سے ان سے پہلے کے مراسم تھے) اور پہلی عرضداشت کی نقل بھی ملفوف کر دی۔ مولوی صاحب نے نواب مختار الملک کو اپنے نام کا یہ خط دکھایا اور عرضداشت بھی پیش کی۔ اس پر حکم ہوا کہ دارالانشا میں تفتیش اور تلاش کی جائے، تاکہ میرزا صاحب کو جواب لکھا جا سکے۔ اس دوران میں کلّیاتِ نظم فارسی کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ چکا تھا۔ میرزا نے حسبِ سابق اس کا ایک نسخہ بھی مولوی مویّدالدّین خاں کی معرفت نواب صاحب کی خدمت میں بھیج دیا اور لکھا کہ اگر پہلا قلمی قصیدہ دارالانشا میں دستیاب نہ ہو سکے، تب بھی یہ کلّیات مطبوعہ میں ممدوح کی نظر سے گزر سکتا ہے (نگار لکھنؤ اپریل ۱۹۵۹ء، ص ۹-۱۰)

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انھیں قصیدے پر کچھ انعام ملا یا نہیں۔

کتابیات

۱- مرقعۂ عبرت از نواب عمادالملک سیّد حسین بلگرامی (ترجمہ مولوی مہدی حسن)
اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد (۱۳۰۰ھ)

۲- ریاضِ مختار یہ سلطنت آصفیہ ٭ از میر دلاور علی دانش
مطبع ہزار داستاں، حیدرآباد (۱۹۴۲ء)

۳- سرسالار جنگ اعظم ٭ از ابوالمکارم فیض محمدؐ
افتخار پریس، حیدرآباد (۱۹۵۰ء)

۴- تاریخ حیدرآباد دکن ٭ از مولوی محمد نجم الغنی
نولکشور پریس، لکھنؤ (۱۹۳۵ء)

۵- کلیات نثر غالب (فارسی) ٭ از غالب
مطبع نولکشور، لکھنؤ (۱۸۸۴ء)

۶- کلیات نظم غالب (فارسی) ٭ از غالب
مطبع نولکشور، لکھنؤ (۱۹۲۴ء)

۷- اُردوی معلی ٭ از غالب
کریمی پریس، لاہور (۱۹۲۲ء)

۸- نگار (ماہنامہ) لکھنؤ - اپریل ۱۹۵۹ء

۹- دستاویز ٭ Pol. A-Sept., 1880- NOS. 150/158
(موجودہ دفتر خانۂ قومی ہند، نئی دہلی)

۱۰- دستاویز ٭ Pol. A-April 1583- NOS. 95/100
(موجودہ دفتر خانۂ قومی ہند، نئی دہلی)

سکندر علی وجد

غزل

اہلِ جنوں کی لغزشِ پیہم — دنیا کے سنگیت کا سرگم

ایک حقیقت ایک فسانہ — آنکھ میں آنسو پھول پہ شبنم

حُسن کی اک معصوم نظر سے — دل کی دنیا درہم برہم

وہ تصویرِ حسن و جوانی — گنگا اور جمنا کا سنگم

اُن کی ہستی کیف سراپا — اپنی ہستی درد مجسّم

جب سے مری محفل سے گئے وہ — نبض کی جنبش مدّھم مدّھم

اے شبِ ہجراں ہم کو اُن کے — غم کا بھی غم اپنا بھی غم

تیرے سوا اے جلوۂ جاناں — جو کچھ دیکھا بھول گئے ہم

جانِ سخن ہے شانِ سخن ہے — شوقِ زُلیخا عصمتِ مریم

ایک تبسّم غنچہ غنچہ — ایک تجلّی عالم عالم

وجد جہاں میں اہلِ نظر کا
کوئی نہیں ہے مونس و محرم

میکشؔ اکبرآبادی

مرزا غالب ایک صوفی کی حیثیت سے

(اپنے چند غیر مطبوعہ خطوط کی روشنی میں)

"علم تصوّف سے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" ان کو (مرزا غالب کو) خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعے سے گزرے تھے اور سچ پوچھئے تو انھیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا۔"

یادگارِ غالب صفحہ ۷۰

مطبوعہ مطبع فیض عام علی گڑھ

"انھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہلبیتِ نبی کی محبت"

یادگارِ غالب صفحہ ۷۶

"لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پہ جاری رہتے ہیں۔

لا الہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ"

یادگارِ غالب صفحہ ۹۴

ان اقتباسات سے ثابت ہے کہ مرزا غالب کا صوفی ہونا کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے صوفی تھے۔ انکا تصوّف کی کتابوں کا مطالعہ بہت عمیق تھا اور یہ کہ وہ خالی اوقات میں مسئلہ وحدۃ الوجود پر غور بھی کیا کرتے تھے۔

اس غور و فکر کو تصوّف میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور مجاہدہ و اعمال پر اسے بہ مراتب فوقیت دی گئی ہے۔ الطبقات الکبریٰ میں علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خاص صحابی حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

وکان رضی اللہ عنہ یقول تفکر ساعۃ خیر من قیام اربعین لیلۃ

"وہ (ابودرداء رضی اللہ عنہ) کہا کرتے تھے ایک ساعت کا تفکر چالیس راتوں کے قیام (عبادت و نماز) سے بہتر ہے"

طبقات صفحہ ۱۲ جلد اوّل

"تصوّف ایک مسلک اور عقیدہ بھی ہے، ایک مستقل علم اور فلسفہ بھی ہے اور ایک مخصوص حال اور وجدان بھی۔ کسی ایک ذات میں ان تینوں باتوں کا جمع ہو جانا ایک بڑی اہم بات ہے۔ مرزا غالب کا مسلک اور عقیدہ ان کے اشعار اور مختلف تحریروں سے معلوم ہو چکا ہے۔ لیکن اس فلسفے کے عالم کی حیثیت سے اور صاحب حال وجدان کی حیثیت سے ہم اُن سے واقف نہیں ہیں۔ یہ واقفیت اُن چند غیر مطبوعہ خطوط سے حاصل ہوئی ہے جو مرزا غالب اور حضرت جی خدا نما غمگین رحمۃ اللہ علیہ کے مابین لکھے گئے، اور جو حضرت غمگیں کے ایک مرید خاص حضرت ہدایت النبی صاحب قادری گوالیاری نے ایک رسالے کی شکل میں

مرتب کرتے ہیں۔ یہ خطوط حضرت غمگینؒ رح کے سجادہ نشین عالی جناب کپتان سردار سید غنی محمد شاہ حضرت جی کی ملکیت ہیں اور ان کے صاحبزادہ حضرت سید رضا محمد حضرت جی کی نوازش خاص کے سبب سے میں ان سے استفادہ کر سکا ہوں۔

یہ سب خط تعداد میں ۱۲ ہیں جن میں سے ۹ مرزا غالب کے اور باقی حضرت غمگین رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔ مرزا غالب نے حضرت صاحب کو قبلۂ حاجات اور پیر و مرشد کے القاب سے مخاطب کیا ہے اور حضرت صاحب نے مرزا صاحب کو مشفق کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ ان خطوط میں سے اکثر حقائق اور مسائل تصوف کے اعتبار سے بہت اہم ہیں اور اس علم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک نعمت الٰہی اور لطیفۂ غیبی۔ لیکن اندازِ بیان اور فلسفیانہ اصطلاحات اور خود مسائل کے دقیق ہونے کی وجہ سے عام دلچسپی کی چیز نہیں البتہ مرزا غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے چند نکات بہت اہم ہیں۔

(۱) یہ کہ مرزا غالب اپنے صوفیانہ عقائد کے علاوہ عملاً بھی صوفی تھے اور شغلِ برزخ ان کا معمول تھا۔ یہ شغل صوفیوں میں منتہی حضرات کا شغل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ فنا و بے خودی کی کیفیت سے بھی سرفراز تھے اور یہ حال ان پر اکثر طاری ہو جاتا تھا۔ اس حال کی صوفیوں کے تمام مکاتیبِ فکر میں بڑی قدر و قیمت ہے اور اسلامی اور غیر اسلامی صوفیوں کی ایک اہم منزل ہے۔

(۲) مرزا غالب کی واقفیت فلسفۂ ما بعد الطبیعیات اور مسائلِ تصوف سے غیر معمولی تھی۔ یہ قابلیت اُن کے خطوں سے بھی معلوم ہوتی ہے اور خود حضرت غمگین نے بھی اس کا اعتراف فرمایا ہے۔ ایک خط میں حضرت نے لکھا ہے کہ جو واقفیت آپ کو ہے وہ اس دور کے علماء ظاہر کو نہیں ہے۔

(۳) مرزا صاحب اپنے شغل و نوشی کو اپنے بزرگوں اور قابلِ احترام شخصیتوں سے بھی پوشیدہ نہیں رکھتے تھے لیکن اپنے کمالاتِ باطن کو اپنے احباب پر بھی ظاہر نہ کرتے تھے۔ درحقیقت یہ ایک بڑی نادر اور اخلاقی اعتبار سے بہت اہم خوبی ہے جس سے عموماً بڑے بڑے صاحبانِ باطن اور علماء و متقی بھی محروم ہیں۔

اصل مسائل کی تفصیل کے لئے پورے خطوط کا مطالعہ ضروری ہے پھر بھی اس مضمون سے خطوط کے مضامین اور مسائل کا بہت کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

حضرت غمگین اور مرزا غالب کے ان خطوں میں خاص زیرِ بحث مسئلہ وحدۃ الوجود اور فنا کا ہے۔ بے خودی یا فنا دراصل وحدۃ الوجود ہی کا ایک ذیلی یا ثانوی مسئلہ ہے۔ یہ دونوں نظریے اسلامی اور غیر اسلامی تصوف میں مشترک ہیں۔ وحدۃ الوجود کو ان سادہ الفاظ میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ برہما یا خدا کے سوا کوئی موجود نہیں ہے، لیکن اربابِ وحدۃ الوجود کے مختلف مکاتیبِ خیال ہیں۔ ان کے فرق کو سمجھے بغیر اس مسئلے کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس مسئلے کا اندازِ بیان اور طرزِ استدلال ابتدائی عہد کے اسلامی صوفیوں کا وہی تھا جو قرآن و حدیث اور اس دور کی دوسری اہم تصانیف کا تھا۔ یہ سادہ اندازِ بیان سنائیؒ عطارؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے زمانے تک ملتا ہے۔ اس اندازِ بیان کے علاوہ دوسرا انداز جو یونانی فلسفے کے اثر سے پیدا ہوا وہ شیخ محی الدین ابن عربی کا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین عربی شیخ شہاب الدین سہروردی کے ہم عصر ہیں۔ وہ اپنے نظریات کا ماخذ اور اصل قرآن و حدیث کو ہی قرار دیتے ہیں۔ مگر ان کے استدلال کا انداز صاف اور سادہ نہیں ہے بلکہ اس میں نو فلاطونی نظریات اور فلسفے کی اصطلاحات شامل ہو گئی ہیں۔ ابن عربی کے بعد کی تصانیف میں منطق اور فلسفے کی اصطلاحات اور زیادہ شامل ہوتی گئیں اور جن دلیلوں سے متاخرین فلاسفہ اپنے نظریات ثابت کرتے تھے۔ ان دلیلوں سے ہی صوفیہ نے ان کے مسلک کی تردید اور اپنے مسلک کی تائید کی۔ مرزا غالب اور حضرت غمگین کے زمانے میں یہی طرز مقبول تھی اور یہ خطوط اسی طرز کا کامیاب نمونہ ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی جو اپنے زمانے میں علومِ معقول کے امام

لہ حضرت غمگین رح کا حال مختلف کتابوں میں ہے اور اتنا معروف ہے کہ اس موقع پر اس کی تفصیل غیر ضروری معلوم ہوئی۔ حضرت کا سنہ پیدائش ۱۱۶۶ھ مطابق ۱۷۵۳ء اور وفات ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۱ء) ہے جب کہ مرزا غالب کا سالِ پیدائش ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) اور سالِ وفات ۱۲۸۵ء مطابق ۱۸۶۹ء ہے۔

سمجھے جاتے تھے وحدۃ الوجود کے بڑے زبردست حامی تھے اس پر ان کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف بھی ہے جس کا نام "فیض الموجود فی اثبات وحدۃ الوجود" ہے۔ مجھ سے مولانا کے بھتیجے مولانا اولاد حسین صاحب خیرآبادی فرماتے تھے کہ مولانا کے اثر سے ہمارے خاندان کی لونڈیاں تک وحدۃ الوجود کو حق سمجھتی تھیں۔ اس کے علاوہ حسنِ اتفاق سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی جو علوم منقول (تفسیر حدیث وغیرہ) کے امام تھے اس مسئلے کی حقانیت کے قائل تھے اور اس وجہ سے علماء ظاہر بھی اس سے متاثر تھے۔ غالب اور مولانا فضل حق میں بہت زیادہ ارتباط تھا اس لئے قیاس یہ ہے کہ علاوہ اور وجوہ کے۔ مولانا کی صحبت بھی ان پر اثر انداز ہوئی ہوگی۔ لیکن یہ سب باتیں صرف علمی اعتبار سے مرزا غالب کو متاثر کرسکتی تھیں اور ان کے عقیدے کے قیام میں مدد دے سکتی تھیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ مرزا غالب کو صوفیوں کے اشغال کے طریقے اور ان کی مشق و مزاولت کے سلیقے کیسے معلوم ہوئے۔

اس بارے میں مولانا محمد حسین آزاد کی یہ اطلاع رہنمائی کر سکتی ہے کہ مرزا غالب کو مولانا فخرالدین دہلوی[2] کے خاندان میں بیعت تھی۔ آب حیات میں آزاد نے یہ صراحت نہیں کی ہے کہ وہ کس سے بیعت تھے لیکن مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں کئی جگہ یہ ذکر کیا ہے کہ مرزا صاحب حضرت میاں کالے صاحب[3] کے مکان میں کئی سال رہے اور حضرت کے ذریعے سے مرزا غالب کی رسائی قلعۂ معلیٰ تک ہوئی۔ حضرت میاں کالے صاحب حضرت مولانا فخرالدین دہلوی کے پوتے اور جانشین تھے اور خود بہادر شاہ بھی حضرت سے بیعت تھے اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ مرزا غالب کو صوفیانہ تعلیمات حضرت میاں کالے صاحب ہی سے پہونچی ہوں گی۔

اس تمہید کے بعد اصل خطوط میں سے کچھ مخصوص موضوعات و مضامین کی طرف اشارات پر اکتفا کی جاتی ہے جس سے ان خطوط سے اجمالی تعارف بھی ہو جائے گا اور کوئی خاص قابلِ ذکر بات رہ بھی نہ جائے گی۔ اصل خط فارسی میں ہیں ان کی عبارات نقل کرنے سے قصداً گریز کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ خط حضرت جی کے خاندان کی ملکیت ہیں۔

پہلا خط مرزا غالب کا ہے۔ یہ خط حضرت جی کے دو خطوں اور ایک غزل کی رسید میں ہے۔ مرزا صاحب کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جی نے مرزا صاحب سے استمزاج کیا ہے کہ میں رباعیات کے دیوان کے دیباچے میں آپ کا ذکر کردوں اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ جب دیوان رباعیات آپ تک پہونچے تو اسے غیر کی نظر سے پوشیدہ رکھئے گا۔

مرزا غالب نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے کہ آپ نے یہ رباعیاں میرے لئے لکھیں اور لکھا ہے کہ دیباچے میں میرا ذکر نہ صرف میرے لئے بلکہ میرے باپ دادا کے لئے باعثِ ناز و فخر ہے۔ دیوان رباعیات کے اخفا میں تعمیلِ ارشاد کی جائے گی۔ مگر حضور نے لکھا ہے کہ غیر کی نظر سے پوشیدہ رکھنا تو یہاں غیر کون ہے۔ یہ ایک لطیفہ کے طور عرض کیا گیا ہے ورنہ بات یہ ہے کہ ان حقائق و معارف کے سمجھنے والے کتنے ہیں اور جو سمجھنے والے ہیں وہ غیر نہیں ہیں۔

یہ خط دس تاریخ ذالحجہ کو لکھا گیا سنہ درج نہیں ہے۔

اس خط کے جواب میں حضرت جی نے تحریر فرمایا ہے کہ لفظ غیر پر جو اعتراض آپ نے کیا ہے میں اس سے خوش ہوا۔ اس جودتِ طبع اور سخن رندانہ کے ساتھ خدا ملاقات جسمانی بھی کرامت فرمائے۔ غیر تو ایک بے معنی لفظ ہے اس کے معنی بھی عین ہی کے ہیں کیونکہ عین اور غیر دونوں حق کے نام جیسے ہادی اور مضل۔ الفاظ سے حقیقت نہیں بدلتی لیکن اگر میں اور تو، یہ اور وہ کے الفاظ عبارت سے نکال دئے جائیں تو عبارت کے معنی ہی سمجھ میں نہ آئیں گے۔

اس کے بعد حضرت جی نے ابن عربی[1]، جنید[2] و شبلی[3] کے اقوال اور احادیث کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسرار و رموز کو ان حضرات نے بھی پوشیدہ رکھنے کی تاکید کی ہے۔ حالانکہ یہ لوگ تمام عالم کو عینِ حق سمجھتے تھے۔ اس عالم میں ہم خود ہی اپنے غیر ہیں۔ یہ باتیں باریک ہیں اور بغیر اس مقام پر پہونچے ہوئے سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ رسولِ خدا کے زمانے سے آج تک تمام صوفی ان باتوں کو پوشیدہ رکھتے آئے ہیں آپ بھی میرے کہنے پر عمل کریں جب تک مجھ سے آپ نہ ملیں گے ان

باتوں کا سمجھنا مشکل ہے۔

روئی سے ہی تمام کپڑے بنے ہوتے ہیں اور کپڑا روئی ہی کی ایک شکل ہے لیکن کوئی چادر اور دُھسّے کو روئی نہیں کہتا اسی پر عین اور غیر کو قیاس کریجیے۔ رباعی

اس ایک وجود میں یہ کیا کیا ہے سیر ۔۔۔ زاہد ہے حرم ہے اور غمگین ہے دَیر
اسما و صفات ہیں یہ نمائش کے ۔۔۔ کہنے سے عین ہو نہ کہنے سے غیر

گو چرخ چہارمیں کی تجھ کو ہے سیر ۔۔۔ اس کا تو غیر اور تیرا ہے وہ غیر
یہ شترِ خودی نہ جانے جب تک تجھ سے ۔۔۔ حاصل عینیت غمگیں ہے خیر

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ اگر آپ اسے تجزیہ نہ سمجھیں اور اس میں اپنا فائدہ سمجھیں تو بات یہ ہے کہ میرا غیر آپ کے عین سے اچھا ہے

رباعی

وہ شخص لطیف اور وہ فہم ہے پاک ۔۔۔ شائستہ ہوا سبب عقل جس کا چالاک
غمگین جو زخش بے محابا ہو تیز ۔۔۔ انسان کو شرط اس سے ہے خوف ہلاک

مرزا غالب نے اس خط کے جواب میں جو خط لکھا ہے وہ افسوس اور معذرت پر مبنی ہے اور خط کا ایک حصہ اسی معذرت پر صرف کیا ہے کہ میں نے عین اور غیر کے متعلق جو کچھ لکھا وہ گستاخی مثنی حق بات یہی ہے جو حضرت نے لکھی ہے میرا مقصد صرف یہ ذرہ سینی تھا کوئی ادعا یا سرکشی نہ تھی خیال یہ کیا تھا کہ یہ بات ذوق آفریں ہوگی مگر خوبیٔ تقدیر کہ اس نے مجھے پریشانی میں ڈال دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ خط کے علاوہ حضرت جیؔ نے کوئی اور خط بھی مرزا صاحب کو لکھا تھا جس میں اظہار ناراضی تھا اور دیوانِ رباعیات کے نہ بھیجنے کے قصہ کا اظہار تھا۔ اسے مرزا غالب کو بہت تکلیف پہنچی اور انھوں نے اپنی تکلیف کے اظہار کے ساتھ ہی اپنی نازک مزاجی کی طرف بھی اسی طرح اشارہ کیا اور لکھا کہ

میرے رنج و غم کا سبب یہ ہے کہ آپ کا پہلا خط ارشاد و ہدایت لیکن دوسرا خط عتاب آمیز ہے جس کا تحمل میں اپنی ناتوانی کی وجہ سے نہیں کر سکتا ہوں۔ پھر یہ شعر لکھا ہے

ما تنگ ظرفاں حریف ایں قدر سختی نہ ایم ۔۔۔ دانہ انبکیم ما را گردش چشم آسیا ست

پھر لکھا ہے کہ رباعیات کے نہ بھیجنے کی شہرت میرے لئے دوُر باش کے ہم معنی ہے جو میرے دل کو خون کئے دیتی ہے حالانکہ مجھے آپ کے وعدے سے بے اندازہ مسرت تھی اور میں منتظر تھا کہ رباعیات مجھے کب موصول ہوں۔

اسی سلسلے میں مرزا غالب لکھتے ہیں کہ آپ نے اسی خط میں لکھا ہے کہ میں نے سنا ہے کہ عقل کی رسائی اور ذہن کی تیزی میں آپ تفضّل حسین خاں کے ہم پایہ ہیں۔ اس بارے میں میری گزارش یہ ہے کہ تفضّل حسین خاں ایک شخص تھے جو انواع علوم کے عالم تھے۔ طب، نجوم ہیئت اور ہندسہ خوب جانتے تھے اور ہر قسم کے علم میں بات کر سکتے تھے۔ میں نے تو صرف و نحو بھی نہیں پڑھی اور منطق و معانی بھی نہیں جانتا ایک ناتمام فارسی کی واقفیت سے میں ان کے مرتبے تک کیسے پہونچ سکتا ہوں۔ اس موقع پہ مجھے اپنی ایک غزل کا مطلع اور حسن مطلع یاد آگیا۔

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو ۔۔۔ کافر نہ توانی شد ناچار مسلماں شو
زیں بر زہ رواں گشتن قلزم نہ تواں گشتن ۔۔۔ جوئے بہ خیاباں رو سیلے بہ بیاباں شو

اس کے بعد مرزا صاحب نے پھر تصوّف کے اسی خاص مسئلے کا تذکرہ کیا ہے جو اُن کا محبوب ترین نظریہ ہے۔ انکسار کے بعد فرماتے ہیں کہ میں اتنا جانتا ہوں کہ مجھے یزداں کی طرف مائل کر دیا اور تھوڑی سی بے خودی عنایت کر دی ہے۔ وجود کی تقسیم پر جیسا کہ اہلِ ظاہر کا اعتقاد ہے میں یقین نہیں رکھتا کیونکہ وجود ایک ہے اور ہرگز تقسیم قبول نہیں کر سکتا نہ اس میں تغیر تبدل واقع ہو سکتا ہے اور وجود کے مقابلے میں عدم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ وجود اور ہستی کے علاوہ جو کچھ ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے اور حق کے سوا جو کچھ ہے وہ باطل ہے۔

ما ہماں عین خودیم اما خود از وہم دوئی
درمیانِ ما و غالب ما و غالب حائل است

ہر قسم کے ذکر و فکر اور ذوق میں سے میرے دل کو محی الدین ابن عربی کے ایک فقرے نے اپنی طرف کھینچ لیا ہے کہ "الحق محسوس والخلق معقول" (یعنی خلق کا وجود ہماری عقل و فہم کے سوا کہیں نہیں ہے اور جو کچھ بھی محسوس ہوتا ہے وہ حق کے سوا کچھ نہیں) میرا ایمان یہی ہے باقی سب وہم ہے اور اس عالم میں جو کچھ ہے از قسم نبوت و ولایت، حشر و نشر، عذاب و ثواب

سب درست ہے اور ان سب پر میرا ایمان ہے — اس کے بعد لکھتے ہیں کہ آپ کی توجہ باطنی سے مجھے بے ارادہ اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کا قول مبارک یاد آگیا ما شمت الاعیان رائحۃ الوجود یعنی اعیانِ ثابتہ نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی۔ اس موقع پر مرزا غالب نے اپنے یہ سطر لکھے ہیں

چوں پردۂ شب یار مصور بخیال است | ایں کارگہ وہم ز پیدائی اشیا
اندیشہ و صد گل کدہ گل بردہ بدامن | ما ہمہ از نقش و نگار پہ عنقا
آئینہ بہ پیش نظر جلوہ فراواں | دل پہ ہوس و صاحب خلوت کدہ تنہا

پھر لکھتے ہیں کہ مرشد کے حضور میں ان حالات کا عرض کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک گھڑا پانی کا دریا کے لئے لائے یا ایک پھول کی پنکھڑی باغ کی نذر کرے۔ لیکن مقصد صرف اپنے عقیدے کا اظہار ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ عقیدہ رکھنے والا کسی چیز کا منکر نہیں ہے اور سب کو ایک کیفیت کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ کفر کو بھی اور اسلام کو بھی، عین کو بھی اور غیر کو بھی، یہ سب تصور کی حیثیت سے موجود ہیں لیکن وہ تصور نہیں جو ہم کرتے ہیں بلکہ وہ تصور جو اس کیفیت خاص کو حاصل ہے اس موقع پر بہت ہی مناسب ہے کہ اسے سمندر اور موج اور آفتاب اور روشنی سے تشبیہ دی جائے۔

اس کے بعد مرزا غالب نے جس بات کا ذکر کیا ہے وہ بوجوہ اہم ہے اور اس سے ہمیں مرزا صاحب کے متعلق ایک عجیب اور جدید انکشاف ہوتا ہے۔ وہ حضرت غمگین رحمۃ اللہ علیہ کو لکھتے ہیں کہ،

سید امانت علی صاحب جو حضور کے تربیت یافتہ ہیں اکثر مجھے نوازتے رہتے ہیں اور جب خلوت میسر آتی ہے تو ان سے راز کی باتیں ہوتی ہیں ابھی دو تین روز ہوئے کہ بیرنگی کا ذکر آگیا۔ چونکہ میں آج کل بیرنگی کے نظارے میں مبتلا ہوں اس لئے میں نے اس بارے میں مبالغہ کیا

اور کہا کہ اس سے بلند کوئی اور مقام نہیں ہے۔ میر امانت علی صاحب نے کہا کہ اس مقام کا چھوڑنا بھی ایک مقام ہے۔ میں نے کہا یہ صحیح ہے لیکن کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا مقام ہے جو استغراق کی زیادتی کے بعد خود ہی حاصل ہو جاتا ہے اور اس کا حاصل کرنا مشاہدۂ بے رنگی پر توجہ کرنا ہے نہ یہ کہ اس سے قطع نظر کر لی جائے . . . .

پھر حضرت سے مرزا صاحب عرض کرتے ہیں کہ خدا کے لئے مجھ پر ایسی توجہ فرمائیں کہ میرا یہ شغل ترقی کر جائے تاکہ رفتہ رفتہ میں بالکل مستہلک اور مستغرق ہو جاؤں اور رنگ اور بے رنگی دونوں سے چھوٹ کر عدم محض ہو جاؤں۔

اس خط پر صرف تاریخ، دن اور وقت ہے سنہ نہیں ہے۔ یہ خط ۲۸ محرم ہفتے کے دن چاشت کے وقت لکھا گیا ہے۔

مرزا صاحب کے اس خط کے جواب میں حضرت شاہ غمگین نے مرزا صاحب کے عقیدت کی تصدیق و تحسین فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ،

مجھے آپ کا عقیدہ معلوم کرکے ناقابلِ اظہار اور بے اندازہ خوشی ہوئی۔ مجھے آپ سے دلی محبت ہے اور میرا دل خود بخود آپ کی طرف کھنچتا ہے۔ میں آپ سے کیسے ناخوش ہو سکتا ہوں میں نے جو کچھ لکھا تھا محبت سے لکھا تھا۔ آپ مجھ سے خدا کے واسطے محبت رکھتے ہیں نہ آپ کو مجھ سے کوئی دنیاوی غرض ہے نہ دینی . . . . .

اس کے بعد حضرت نے مرزا صاحب کے شغل پر تبصرہ فرمایا ہے اور حیرت مذموم اور حیرت محمود کا فرق بتایا ہے اور اپنے سلوک و اشغال و واردات بیان کئے ہیں۔ اپنے پیر اور اپنے سفر کا حال بیان فرمایا ہے۔ اس خط سے حضرت غمگین کے مجاہدہ و ریاضت اور مقام کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ خط دوسرے سالکین راہ کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ غالباً اسی خیال سے حضرت نے مرزا صاحب کو تفصیل سے اپنے حالات لکھے ہیں۔ اس خط میں جو رباعیاں حضرت نے لکھی ہیں وہ ارباب ذوق کی خدمت میں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

غمگیں ہوتا اگر تجھے علم یقیں | بے عین یقیں نہ ہوتی دل کو تسکیں
پھر حق یقیں کے ذوق اور شوق میں یار | ہوتا بس حق حق تراملت و دیں

۱؎ شغل بیرنگ، صوفیوں کا ایک خاص شغل ہے جو آنکھیں کھول کر آسمان یا خلا میں نظر جما کر کیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ بے خودی اور ربودگی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جسے فنا بھی کہتے ہیں اور جس کا حصول تمام سلاسل تصوف میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔

ایک عمر رہی ہے میری اللہ کی جنگ
دنیا رہا میں شکست سو سو نز ننگ
غمگین مغلوب اب ہوا ہوں ایسا
نہ فوج رہی نہ ہیں نہ وہ نام و ننگ

عقل کہے جو اسے نہیں وہ عاقل
وہ میداں جو سمجھے وہ نہیں ہے واصل
کہتے نہ رسول ما عرفنا غمگیں
جز عجز نہ ہوتی معرفت گر حاصل

تو قول علی میں اور منت لاشتبہات
غمگیں ہے یہی عرفت ربی کی بات
ہے فسخ عزائم اس لئے فرمایا
آتی ہی نہیں ہے علم میں کنہ ذات

ہو جس میں کہ بافت ہے وہ حیرت محمود
مذموم ہے ہو شہود جس میں نہ کشود
ہرچند کہ اس کی دید غمگیں ہے محال
ممکن نہیں پر سوائے اس کے مشہود

اس کے بعد حضرت جی نے لکھا ہے کہ ایک تازہ مضمون کی رباعی کہی ہے جو داد کی غرض سے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں

گر ظلمت نہ اس شراب رمانی پہ
مت کبر کر اپنی زہد پیشانی پہ
گر کفر دوئی نہیں تجھے اے زاہد
قشقۂ کبود ہے کیوں پیشانی پہ

مرزا غالب نے اس خط کے جواب میں حضرت کی اس آخری رباعی کی بہت داد دی ہے اور لکھا ہے کہ اس رباعی کے مضمون کی تازگی نے مجھے بے خود کر دیا واللہ کہ کسی سخن ور کا ذہن اس نکتے تک نہ پہونچا اور کسی نے زاہد کے پیشانی کے داغ کو قشقۂ کبود سے تشبیہ نہیں دی۔
اس کے بعد ایک رباعی کے متعلق لکھا ہے کہ شاید میر حیدر علی سے رباعی کی نقل میں سہو ہو گیا ہے کیونکہ پہلے بیت میں قافیے کے بعد "کو" آیا ہے اور دوسرے بیت میں "کو" نہیں ہے یہ بات قاعدۂ شعر کی رُو سے جائز نہیں ہے۔ رباعی یہ ہے

چل راہ بریدہ پائے لنگی چھوڑ
رکھ جان کو فراخ دل کی تنگی کو چھوڑ
رنگوں میں نہ قیدرہ مشائخ کی طرح
غمگیں آزاد ہے تو بے رنگی چھوڑ

مرزا غالب نے حضرت کے اس ...

ملول کر دیا اور میں اس بات پر مجبور ہو گیا کہ بات کو تفصیل سے عرض کروں۔ قبلہ و کعبہ! راستی میرا آئین اور محبت میرا دین ہے میں سچ کو ایمان اور جھوٹ کو کفر سمجھتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے جو ارادت اور محبت آپ سے ہے وہ شرح و بیان میں نہیں آسکتی .... عنایت اور عتاب دونوں التفات کا نتیجہ ہیں۔ رہا اغراض دنیاوی و دینی کے بارے میں تو الحمدللہ کہ میرا دل ان دونوں چیزوں سے پاک ہے میں محبت کے سوا نہ دنیا سے واقف ہوں نہ دین سے۔ میں ہیچ اور نادان ہونے کے باوجود اتنا جانتا ہوں کہ وجود ایک ہے اور ہرگز منقسم نہیں ہو سکتا اگر میں دنیا اور دین کو مان لوں تو شرک فی الوجود میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ جو شرک کی بدترین قسم ہے۔ میرے نزدیک دین بھی دنیا کی طرح ایک نقش موہوم ہے اور وہم سے دل لگانا نہیں چاہئے۔ دنیا کے طلبگاروں کو دنیا اور دین کے طلبگاروں کو دین مبارک۔ ہم ہیں اور سواد الوجہ فی الدارین جس کا مطلب ہے نیستی محض۔ اس بارے میں یہ قول حق ہے کہ اعیان نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی (الاعیان ما شمت رائحۃ الوجود) یہاں وجود کا مطلب اس ہستی موہوم سے ہے یعنی اس ہستی موہوم کا ظہور اور نمائش۔ اور یہ نمائش محض وہم اور باطل ہے اور یہ سب کچھ محض اعتبار ہے اس کی حقیقت نہیں ہے۔ اعیان ثابتہ سے لے کر حشر تک جو کچھ نمائش اور ظہور ہے سب باطل ہے وجود میں کوئی تغیر نہیں ہوا وہ اسی ایک حالت پر ہے...
اس کے بعد مرزا صاحب نے تفصیل سے اعیان ثابتہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ جو بات اوپر بیان کی گئی ہے اس کی تشریح کی ہے اس کے بعد بے رنگی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں اور حضرت جی نے جو ایراد کیا تھا اس کا جواب دیتے ہیں

Scanned by CamScanner

حضرت! اس غلام نے اپنی نظر خلا میں نہیں پھیرائی ہے
بلکہ دل کو بے رنگی سے باندھ لیا ہے اور اعیان ثابتہ کی بحث
میں جو ذکر کیا گیا ہے یہی میرا منظورِ نظر ہے۔ میری کوشش
یہ ہے کہ میں اپنی اصل نیستی کی طرف لوٹ جاؤں۔ نہ میں ذکر
جانتا ہوں نہ شغل ع دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست
تحریر میں تقریر کی سی بات نہیں آسکتی میں اس دن کا آرزومند
ہوں کہ شرف قدمبوسی حاصل کروں اور آپ کی زبان سے آپ
کے ارشاد سنوں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ تمھارے تصوّف کی
طرف سے مجھے پورا اطمینان ہوگیا تو جناب واقعہ یہ ہے کہ میں
تو ایک بے علم اور جاہل سپاہی زادہ ہوں میرے باپ دادا
صحرا نشین ترک تھے۔ میں دو ایک مصرعے موزوں کر لیتا ہوں
اور ایک دو لطیفے ہر فن کے کہہ لیتا ہوں۔ تصوّف سے میرا
کیا تعلق اور درویشی سے مجھے کیا نسبت۔ میرا حال اس سے
زیادہ نہیں ہے کہ وحدتِ وجود اور اشیا (موجودات)
کا معدوم ہونا میرے خمیر میں ڈال دیا گیا ہے اور "حق محسوس
ہے اور خلق معقول" میرا عقیدہ بنا دیا گیا ہے میں اتنا
جانتا ہوں کہ صرف ایک موجود ہے اور اس کے سوا کچھ
موجود نہیں ہے اس کے سوا میری ہمت کوشش و رغبت
اور دولت و مال صرف ایک دو شراب کے پیمانے پر منحصر
ہے جو رات کو پی لیتا ہوں اور مست ہو کر سو جاتا ہوں نہ دین
سے واقف ہوں اور نہ دنیا سے الٹلبس ماسوی ہوس۔
حاضر ہونے اور سفر کرنے میں گرمی اور بے سامانی مانع نہیں
ہے ایک خرقہ تن پر ڈال لوں اور روانہ ہو جاؤں۔ مگر میرا
مقدمہ جو ولایت گیا ہوا ہے اسے دو سال ہو گئے مجھے امید
ہے کہ امروز فردا یا ہفتہ دو ہفتہ اور مہینہ دو مہینے بعد
ولایت سے حکم آجائے گا اور اس وقت میں گوالیار
روانہ ہو جاؤں گا۔

اس خط پر ۱۸۔ ربیع الاوّل روز شنبہ ہنگام نیمروز ۱۲۵۵ھ
درج ہے۔

اس خط کے جواب میں حضرت جی نے جو خط مرزا غالب کو لکھا ہے
اس میں وضاحت اور فراخ دلی سے اس کا اعتراف فرمایا ہے کہ
رباعی میں قافیے کی غلطی سہو کاتب کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ
میری بے حواسی اور پریشان خیالی اس کا سبب ہے یہ ایسی
غلطی ہے جو کوئی نادان بھی نہ کرے گا حالانکہ تقریباً بیس
دفعہ میں نے اس رباعی کو پڑھا لیکن اس عیب کی طرف
خیال ہی نہ گیا اگر آپ اس کی اصلاح نہ کرتے تو یہ رباعی
دیوان میں اسی غلطی کے ساتھ درج ہو جاتی . . . .

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

اسی سبب سے میں نے بارہا آپ کو لکھا ہے کہ چوں کہ
اللہ تعالیٰ نے آپ کو فنِ سخنوری میں یکتائے زمانہ کیا ہے
لہٰذا آپ میرے دیوان کو اوّل سے آخر تک اصلاح کی نظر
سے دیکھ لیں لیکن آپ تساہل سے کام لیتے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے
محبت رکھتے ہیں تو میری اس عرض کو ضرور قبول کریں۔ یہاں
میرے ہم نشینوں کو اتنی جرأت نہیں ہے کہ میرے اغلاط
پر مجھے مطلع کریں۔

اس کے بعد مرزا غالب کی حقائق فہمی کا ان الفاظ میں اعتراف فرماتے ہیں:

آپ کو علم تصوّف میں جو دستگاہ ہے جس کا اظہار آپ
کے خطوں سے ہوا وہ علمائے ظاہر کو بھی نہیں ہے . . .

اس کے بعد اعیان ثابتہ کی بحث کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

اس قول میں (اعیان نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی)
وجود سے مراد وہی وجود نہیں ہے بلکہ اعیان تو عینِ ذات
ہیں۔ آپ نے جو تشبیہ اس سلسلے میں آفتاب کی شعاعوں
کی دی ہے وہ مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ آفتاب میں شعاعوں
کا احساس تو نقصانِ بصارت کا سبب ہے ورنہ جو لوگ
کہ آفتاب کا مشاہدہ کرتے ہیں ان کو شعاعیں نظر نہیں آتیں
چنانچہ میں نے بھی ابتدا میں دو سال تک یہ کام کیا ہے[1] . . . .

---

[1] اسے شغلِ آفتابی کہتے ہیں۔ صبح کو طلوعِ آفتاب کے وقت آفتاب پر نظر جماتے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ تصوّر بھی کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد تنزلات کا بالاجمال، بیان فرما کر فرماتے ہیں کہ:

یہ قول (اعیان نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی) حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرف کسی نے بھی منسوب نہیں کیا ہے۔ اگر آپ نے کسی معتبر کتاب میں یہ قول حضرت امامؑ کی طرف منسوب دیکھا ہو تو مجھے بھی مطلع فرمائیں۔ آئندہ سے مسائل تصوف کو ملاقات پر موقوف رکھئے۔ مجھے آپ کا آزادانہ رویہ بہت پسند ہے اور اسی لئے میں آپ کی ملاقات کا خواہش مند ہوں اگر ایسا شاہباز ہاتھ آ جائے تو پھر سوائے عنقا کے شکار کے کسی طرف توجہ نہ کرے گا۔

شاہجہاں آباد (دہلی) میں ہزاروں آدمی ہیں لیکن مجھے ان سے کیا تعلق وہ لوگ تو لانبی ڈاڑھی، کتری ہوئی مونچھیں تسبیح اور ڈھیلے ڈھالے جُبّے چاہتے ہیں اور یہ چیزیں یہاں کہاں۔ میں آپ کے طریقے سے بہت خوش ہوں۔ خدا تعالیٰ آپ کی یکرنگی میں ترقی دے۔ جب مجھ سے ملاقات ہو گی تو میں بھی اسی کی تائید کروں گا۔ یہ طریق میرا پسندیدہ ہے

از درون شو آشنا و از برون بیگانہ وش
این چنین زیبا روش کم می بود اندر جہاں

دیوانِ رباعیات بھی تیار ہو جائے تو وقتِ ملاقات آپ کو دوں گا۔

اس خط پر بھی ۱۲۵۵ھ ہجری درج ہے۔ مرزا غالب نے اس خط کا جو جواب لکھا ہے وہ کلیاتِ نثرِ غالب میں درج ہے اور سوائے اظہارِ عقیدت کے کوئی خاص بات اس میں نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر مرزا غالب کا خط ہے جو اس مجموعے میں مرزا غالب کا پانچواں خط ہے۔ کوئی بات قابلِ ذکر اس میں بھی نہیں ہے سوائے اس کے کہ مرزا صاحب نے اس بات کو قبول کر لیا ہے کہ مسائل وحدت و کثرت آئندہ خطوط میں بیان نہ کئے جائیں گے اور ملاقات پر موقوف رکھے جائیں گے۔

اس کے بعد مرزا غالب کا چھٹا خط ہے یہ خط مرزا غالب نے اس انداز سے شروع کیا ہے کہ عبارت کا رُخ مسائل تصوف کی طرف پھر گیا ہے۔ فرماتے ہیں" میں کافر ہوں اگر کبھی میں نے غیر سے شکر و شکوہ کیا ہو۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

دریا بہ وجودِ خویشتن موجے دارد
خس پندارد کہ این کشاکش با اوست

اس خط میں بھی وحدتِ وجود کا ذکر اور فنا و عدم محض ہو جانے کی تمنا ہے۔ اس خط پر ۳۰ ربیع الثانی، پیر ۱۲۵۳ھ لکھا ہے غالباً سنہ کی نقل میں غلطی ہوئی ہے۔

مرزا غالب کا ساتواں خط ۲ شعبان ۱۲۵۵ھ منگل کا لکھا ہوا ہے اور حضرت صاحب کی رباعیات کی ستائش و ثنا پر مشتمل ہے۔

آٹھواں خط بھی حضرت صاحب کے نام ہے اس میں حضرت کے دیوان کی تعریف اور اس کے پہونچنے کی رسید اور شکریہ ہے۔ اس خط میں وحدۃ الوجود کا ذکر اور اپنا نظریہ اور حال مختصراً بیان کرکے دعا و توجہ کی خواہش کی ہے

نویں خط میں مرزا غالب نے لکھا ہے کہ احباب نے دلی میں طرح دی تھی اس میں میں نے و غزل منظر کئے ہیں جو برنظرِ اصلاح حاضر کر رہا ہوں غزل کا مطلع یہ ہے

در وصل دل آزاریِ اغیار ندانم   دانند کہ من دیدہ ز دیدار ندانم

اس خط پر تحریر تاریخ ۱۸ رجب ۱۲۵۵ھ درج ہے

لہ معلوم نہیں مرزا غالب کے ذہن میں یہ کس طرح جا گزیں ہو گیا کہ الاعیان ما شمت رائحۃ الوجود حضرت امام حسین علیہ السلام کا قول ہے۔ دراصل یہ قول شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا ہے۔ حضرتؑ امام کے زمانے میں اعیان وغیرہ کی اصطلاحیں عرب میں نہیں پہونچی تھیں۔

لہ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ رباعی سحابی کی ہے اس کا پہلا بیت یہ ہے

عالم بخروش لا الٰہ الا ہو ست
غافل بگماں کہ دشمن است او یا دوست

محمد عتیق صدیقی

حبیب اللہ ذکاؔ اور مرزا غالبؔ

انیسویں صدی کے اوائل میں جب اس برِصغیر کے بیشتر حصوں پر "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" ڈنکا بجنے لگا تھا، تو اس وقت ہندوستان کی دفتری، کاروباری اور علمی زبان فارسی تھی۔ امراء، شرفاء اور متوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگ فارسی ہی کو خط و کتابت اور اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے تھے۔ اس کی ایک اچھی مثال یہ ہے کہ اس دور میں اردو شاعری کا مذاق اگرچہ عام ہو چکا تھا، لیکن اردو شعراء کے تذکرے بھی فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے۔

۱۸۳۰ء میں کمپنی انگریز بہادر نے اپنے سیاسی و انتظامی مصالح کی بنا پر فارسی کی سرکاری و دفتری حیثیت ختم کر دی، اور اس کے ساتھ ہی فارسی کے رواں دواں سوتے خشک ہونے لگے اور بالآخر انیسویں صدی نے ۔۔۔ میں اس نے دم توڑ دیا۔ لیکن یہ سانحہ پیش آنے کے بعد بھی ایک مدت تک ایسے لوگوں کی خاصی تعداد باقی رہی جو اس مردہ لاش کو سینے سے لگائے رہے۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والوں میں ایک بزرگ حبیب اللہ ذکاؔ بھی تھے، جو فارسی کا صرف اچھا ذوق ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ اس زبان پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ اور اس کا ثبوت ان کا مجموعۂ نظم و نثرِ فارسی ب "نمائش و خمائش" جو ان کے انتقال کے تقریباً نو سال کے بعد ۱۳۰۲ ہجری مطابق ۱۸۸۴ عیسوی میں مطبع آصفی (حیدرآباد) سے طبع ہوا تھا۔ اس مجموعہ کا "والا جناب مستطاب نواب اسداللہ خاں غالبؔ دہلویؒ کی ایک مختصر اردو عبارت سے آغاز ہوتا ہے، جس کو ہمارے زمانے کی اصطلاح میں "پیش لفظ" کہتے ہیں۔ اس پیش لفظ کے عنوان کی عبارت، جو غالب کی نہیں بلکہ صاحب کتاب مولوی ذکاؔ کی ہے، حسب ذیل ہے:

"سوادِ عبارتے کہ والا جناب مستطاب نواب اسداللہ خان غالب دہلوی در سال ہزار و دو صد و ہشتاد و یک بر پشت مجموعۂ نظم و نثر کہ بغرضِ اصلاح خدمت والا شان فرستادہ شدہ بود، بقلم خویش رقم فرمودہ اند و پایان آن مہر خود زدہ اند۔"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف نے اپنا مجموعۂ نظم و نثر فارسی مرزا غالب کے پاس اصلاح کے لئے ۱۲۸۱ھ (مطابق ۱۸۶۴ء) میں بھیجا تھا۔ اسی مجموعے کی پشت پر مرزا غالب نے اپنی رائے لکھ دی تھی اور اس کے نیچے اپنی مہر بھی لگا دی تھی۔ وہ عبارت یہ ہے:

"یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں، کسی امیر کا نہیں، کسی شیخ شیّاد کا نہیں۔ یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے، اور فقیر اپنے دوست کے کلام کو معرضِ اصلاح میں بہ نظرِ دشمن دیکھتا ہے۔ پس جب تملّق نہیں، مدارا نہیں، تو جو مجھ کو نظر آیا ہے بے حیف و حیل کہوں گا۔

"نثر میں نعمت خانِ عالی کے طرز کا احیا کیا ہے، مگر پیرایہ کچھ اس سے بہتر دیا ہے۔ قصائد میں انوری کا چربہ اڑایا ہے، مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز، منشی حبیب اللہ ذکا سخنور، ہمہ دانِ یکتا، لفظ طراز، معنی آفرین، آفریں صد آفریں

بزار آفریں۔"

منشی حبیب اللہ ذکا کے "خاش و خماش" پر مرزا غالب کا یہ مختصر اردو پیش لفظ ہے۔ اس تحریر کا قابلِ ذکر اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ مرزا غالب جن کو فارسی پر صرف مہارت و قدرت ہی نہیں حاصل تھی بلکہ جو فارسی کے مقابلے میں اردو کو ہیچ و بے حقیقت سمجھتے تھے، انھوں نے ذکا کے "مجموعۂ نظم و نثر فارسی" پر پیش لفظ اردو میں لکھا تھا۔ یہ بات اگر ایک طرف غالب کی حقیقت پرستی کا ٹھوس ثبوت فراہم کرتی ہے تو دوسری طرف ان حضرات پر ایک تجزاضنہ بھی ہے جو اس وقت بھی فارسی ہی پہ جان چھڑک رہے تھے اور کسی طرح بھی ماضی سے اپنے دامن کو جھٹک کر حال سے وابستہ کرنے پہ رضامند نہ تھے۔

خاش و خماش کی فارسی نظم و نثر کو یا اس سے متعلق مرزا غالب کے اظہارِ خیال کو تنقید کی کسوٹی پہ کسنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس مجموعے کے صرف ان حصوں سے ہم کو اس وقت دلچسپی ہے، جن کا مرزا غالب کی ذات سے براہ راست یا بالواسطہ تعلق ہے۔ ان پہلوؤں کا اجمالی ذکر کرنے سے پہلے منشی حبیب اللہ ذکا سے بھی سرسری ملاقات کر لینا ضروری ہے۔

ذکا کا وطن "من مضافات مدراس" تھا جہاں ۱۲۴۴ ہجری (مطابق ۱۸۲۸ء) میں پیدا ہوئے۔ خود ان کی اپنی فکر کے مطابق "بے خود و پرخوست" ان کی تاریخ میلاد ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے "برادر مہربان محمد رحمت اللہ رسا" سے حاصل کی اور میر مہدی علی ثاقب اور سید مرتضیٰ حسینی بنیش کے سامنے "زانوئے سبق تہہ" کئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تلاشِ معاش کی فکر ہوئی۔ چناں چہ "صدرِ وزارت دکن" کا "غلغلۂ نظم امور و آوازۂ قدردانی" سن کر حیدرآباد کا رخ کیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد کم و بیش ایک سال "وسیلت و واسطہ" کی جستجو میں کھپایا۔ ایک بزرگ عبدالوہاب حسینی نے ان کی دستگیری کی اور اس کشمکش سے ان کو نجات دلائی۔ ان کے "قصیدہ و عرض داشت" نے ممدوح تک رسائی پائی۔ بالآخر یکم ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ (مطابق ۱۸۵۵ء) کو ذکا نواب مختار الملک کی سرکار سے باضابطہ وابستہ ہو گئے۔

غالب اور ذکا کے تعلقات کب اور کیوں کر پیدا ہوئے؟ جہاں تک "کب" کا تعلق ہے، اس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ رہا "کیوں کر" کا معاملہ، اس باب میں غالباً ذکا ہی نے پہل کی تھی۔ خاش و خماش میں غالب کے نام جو رقعات ہیں، ان میں جو پہلا خط ہے، وہی ذکا اور غالب کے تعلقات کی غالباً پہلی کڑی ہے۔ جو یوں شروع ہوتا ہے:

" آن کہ در حضرت او خامہ بعرض ادب است
شاہ مردان سخن غالب عالی نسب است
بندگی ہا مقبول و کورنشہا موصول باد از بندۂ روئے خواجہ
ندیدہ و بخوئے خواجہ گرویدہ ۔۔۔۔"

اور جواب کے لئے اپنا پتہ یہ لکھا تھا،

"در حیدرآباد دکن، بدارالانشاء مہین دستور مختار الملک
بحبیب اللہ ذکا برسد "

اس خط پر اور دوسرے خطوں پر بھی تاریخ ارسال درج نہیں ہے، جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ذکا اور غالب کی خط و کتابت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا۔ ذکا چوں کہ "مہین دستور مختار الملک" کے منشی تھے، اس لئے غالب نے ان کے خط کو نعمتِ غیر مترقبہ اور ان کی ذات کو خداداد وسیلہ سمجھا ہوگا۔ چناں چہ غالب نے فوراً ان کے خط کا جواب دیا اور ان کے نام کے آگے 'مولوی' اور نام کے پیچھے 'خان' کا اضافہ کیا۔ اس کے جواب میں ذکا نے لکھا کہ "بندہ نہ پایگاہ مولویت دارد نہ خطاب خانی"۔ ذکا کے خط کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ غالب نے اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ بھی مختار الملک کے نام غالباً براہِ راست روانہ کیا اور ذکا کے خط میں بھی اس کا تذکرہ کیا۔ اس کے جواب میں ذکا نے لکھا کہ:

" رسیدن دیوان اردو را نہ بالقوۃ اثرے است و نہ بالفعل خبرے۔ یا رسیدہ باشد و کسش نہ دیدہ باشد۔۔۔
بندہ را مصرعے از مصنفات جناب بر زبان است ع
گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پہ
(دیوان اردو کے پہنچنے کا نہ تو اب تک کوئی اثر ہی ظاہر ہوا ہے اور نہ اس کی خبر ہی ہے۔ ممکن ہے کہ پہنچ گیا ہو اور کسی نے اس کو نہ دیکھا ہو۔۔۔۔ بندے کی زبان پہ آپ ہی کا مصرعہ ہے
گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پہ)

ایک نسخہ بھیجا اور ساتھ ہی "قصیدہ مدحیہ (نواب مختار الملک)" بھی روانہ کیا جو ممدوح تک پہنچ تو گیا مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ ایک دوسرے خط میں ذکا نے، غالباً غالب کی یاد دہانی پر، لکھا کہ "میر و خرد، منشی عبدالقادر کو اس پر میں نے آمادہ کیا کہ وہ دوبارہ آپ کا ذکر چھیڑیں اور آپ کے معاملہ پھر بیان کریں۔ انھوں نے یہی کیا ہے۔ یہ گذارش دل نشین (ممدوح) ہوئی۔" اور اس خوش خبری کے ساتھ یہ بھی مشورہ دیا کہ "اگر مثنوی نامہ و چھاپہ بوساطت ایجنٹ دہلی دیا دیگر از اہل فرہنگ فرنگ بھیج دیا جائے تو" اس فقرے کا "کہ در برخوان نوال مختار الملک بہادر بخشی و بہرۂ من نیز نہادہ اند) جو آپ نے لکھا ہے، ممکن نہیں ہے کہ بطلان ہو سکے۔"

غالب ہی کے سلسلے میں ذکا نے غالب کے دوستوں سے بھی خط و کتابت شروع کی۔ ایک خط میں غالب ہی کو لکھتے ہیں کہ "منشی غلام غوث بے خبر نے اردو رقعات کے چھپنے کا مژدہ با وعدۂ ارسال سنایا ہے۔" ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ "آپ کے ضعف بصارت کا حال سننے کے بعد میں آپ کو اپنے خطوط پڑھنے کی زحمت نہیں دینا چاہتا۔ اسی لیے نواب مصطفیٰ خاں بہادر (شیفتہ) سے میں نے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔"

ذکا کے اس مجموعہ نظم و فارسی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور غلام غوث بے خبر کے علاوہ منشی نول کشور کے نام بھی دو ایک رقعات ہیں اور ان کا بھی مرزا غالب ہی کی ذات سے تعلق ہے۔

"خاش و خاشاک" کے حصۂ نظم میں "تاریخ چاپ کلیات فارسی غالب"

عمر انصاری

غزل

شکوے کہ ہنسی میں ڈھل گئے ہیں ۔۔۔ دریا تھے جو رُخ بدل گئے ہیں

جس سمت بھی ہم نکل گئے ہیں ۔۔۔ راہوں میں چراغ جل گئے ہیں

کیا ہم سے خطا ہوئی ہے دُنیا ۔۔۔ تیور ترے کیوں بدل گئے ہیں

نکلا نہیں چاند مدتوں سے ۔۔۔ تارے کوئی چال چل گئے ہیں

اللہ ری گردشِ زمانہ ۔۔۔ لوگوں کے خدا بدل گئے ہیں

سننے ہی نہیں صدا کسی کی ۔۔۔ دیوانے کہاں نکل گئے ہیں

معلوم ہے ہم کو اپنا عالم ۔۔۔ کہنے کو تو ہاں سنبھل گئے ہیں

دراصل وہی ہیں دشمنِ جاں ۔۔۔ جو حادثے کل پہ ٹل گئے ہیں

بدلا نہیں دل عمرؔ ہمارا
ہر چند کہ ہم بدل گئے ہیں

هو الله

سواد عبارتی که ذوالاحباب مستطاب نواب اسد الله خان غالب

دهلوی در سال هزار و دو صد و هشتاد و یک بر نسخهٔ مجموعه

نظم و نثر که بغرض اصلاح خدمت فیض‌اثر ایشان فرستاده شده بود

خویش رقم فرموده اند و پایان آن مهر خود زده

Scanned by CamScanner

دازہ

زراعتی میلہ

روسی پویلین

پنجاب کا پویلین
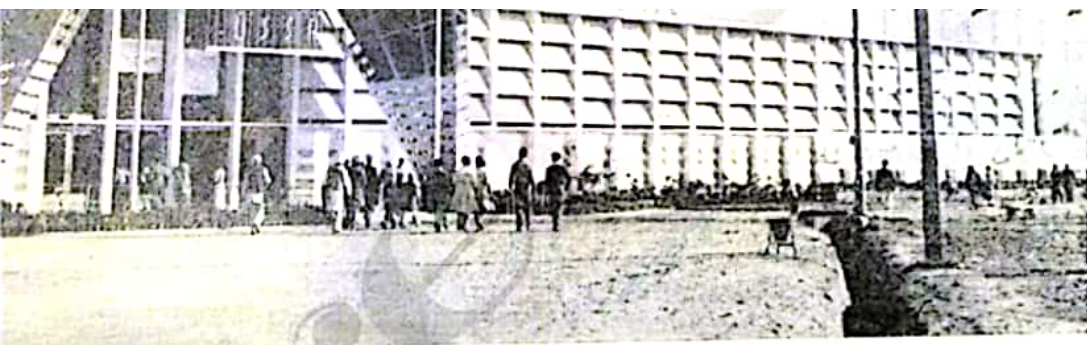
بجھ گیا ایک چراغ

دلؔ شاہجہاںپوری

آج سے پچاس برس پہلے سندیلے کے ایک مشاعرے میں حضرت دلؔ شاہجہاں پوری کے ایک شعر نے سامعین کو زیر و زبر کر دیا تھا یعنی

نہ وہ آرام جاں آیا، نہ موت آئی شب وعدہ
اسی دھن میں ہم اٹھ اٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

انشاؔ کی زمین میں یہ معرکۃ آلارا شعر نصف صدی سے لوگوں کی زبان پر ہے۔ لیکن شب وعدہ موت کے نہ آنے کا شکوہ کرنے والا موت کی آغوش میں جا چکا۔ ۲۵۔ دسمبر کی شب میں دلؔ پر فالج کا شدید حملہ ہوا صبح ہوتے ہوتے زبان بند ہو گئی اور ۲۶۔ دسمبر کو امیر مینائی کی یہ یادگار بھی رخصت ہو گئی۔

آنکھ اپنی نہ جھپکنا تھی نہ جھپکی اے دلؔ
رازداں رنگ بدلتے رہے افسانوں کے

مگر اب کے ایسی آنکھ جھپکی کہ رازداں اور ان کے افسانے دھرے رہ گئے۔ مرحوم قادر الکلام غزل گو تھے۔ انسانی شرافت اور خلق و مروت کا مجسمہ تھے۔ پرانے بادہ کش اٹھتے جا رہے ہیں۔ میخانہ خالی ہوتا نظر آ رہا ہے۔ مرحوم کے انتقال پرملال سے ریاضؔ اور جلیلؔ کی موت تازہ ہو گئی۔ مرحوم ہی کے اس شعر پر اس تعزیت نامے کو ختم کرتا ہوں۔

ہر موج بحر عشق کی طوفان بے پناہ
کھیلا ہوں جان پر تو کنارہ ملا مجھے

عرشؔ ملسیانی

اک چراغ اور بجھا

اسدؔ ملتانی
(۱۹۳۸ء)

اسد خاں اسدؔ ملتانی بڑے نغز گفتار شاعر تھے۔ حال ہی میں پاکستان میں ان کا انتقال ہو گیا۔ لطیف مزاح اور لطف قوافی ان کے خاص محاسن تھے۔ قادر الکلام شاعر تھے۔ سوچ سمجھ کر پختہ شعر کہنا ان کا شعار تھا۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۸ء تک بزم اردو شملہ کے مشاعروں کے روح رواں رہے۔ ان مشاعروں میں جوشؔ، جگرؔ، احسنؔ مارہروی، بیخودؔ و سائلؔ، مرزا ثاقبؔ قزلباش لکھنوی، جوشؔ ملسیانی، پنڈت امرناتھ ساحرؔ دہلوی، فراقؔ گورکھپوری اور ملک کے ممتاز شعراء داد سخن دیتے رہے۔ مسٹر غلام محمد مرحوم سابق گورنر جنرل پاکستان کی معیت میں انھوں نے اردو کی بیش بہا خدمات ادا کی تھیں۔ ان کے اٹھ جانے سے ایک سنجیدہ شاعر، ایک متین ادیب، ایک باوقار مزاح گو اور ایک صاحب فن سے اردو کی صف اول میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان چلے گئے لیکن ہندوستان کے دوستوں ادیبوں اور شاعروں سے ان کے تعلقات میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ اس نثری نوحے کو غالبؔ کے ایک شعر میں تصرف سے مرحوم کے حق میں دعائے خیر پر ختم کرتا ہوں۔

یہ لاش درکفن اسدؔ خوش بیاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

عرشؔ ملسیانی

نادم سیتاپوری

غالب کی حریف ۔ زہرہ و مشتری

مرزا نوشہ کو غالبؔ بنانے میں جو نمایاں حصہ مولینا فضل حق خیرآبادی نے لیا تھا اس کی مثال شاید ہی غالب کی زندگی میں کہیں اور نظر آئے ۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زورؔ کے یہ الفاظ

"اگر مولوی فضل حق (خیرآبادی) سے (غالب کی) ملاقات نہ ہو تو شاید میر تقی میر کی پیش گوئی کی دوسری شق پوری ہوتی جس میں انھوں نے کہا تھا کہ یہ لڑکا (غالب) بھٹک جائے گا۔"

(صفحہ ۱۹ ۔ سرگزشت غالب مطبوعہ ابراہیمیہ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۳۹ء)

اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں جنھیں 'غالبیات' پر ریسرچ کرنے والوں نے نہ جانے کیوں نظرانداز کر رکھا ہے ۔ حالانکہ بنیادی طور پر تمام 'غالب پرست' متفق ہیں کہ مولینا خیرآبادی وہ منفرد شخصیت ہیں جنھوں نے غالب کی زندگی کو اس ڈگر پر لگایا تھا جہاں آج غالب اپنی پوری فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ زندہ ہے ۔

شیخ محمد اکرم صاحب نے 'غالب نامہ' میں لکھا ہے :۔

"مولوی فضل حق (خیرآبادی) غالب کے سب سے بڑے محب اور محسن تھے انھوں نے نہ صرف مرزا کی شعر و سخن کے میدان میں رہنمائی کی جو ان کا اصل "دائرۂ عمل" تھا بلکہ ان کی مالی مشکلات دور کرنے کی بھی کوشش کی ۔"

(صفحہ ۴۰ ۔ 'غالب نامہ' مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ)

اور مالک رام صاحب جیسے 'غالب شناس' کی یہ رائے غالب کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو اس سے زیادہ اُجاگر کرتی ہے :۔

"اگر مولوی فضل حق (خیرآبادی) اور ان کے رفقاء کی صحبت کا فقط اتنا ہی اثر ہوتا کہ وہ شاعری میں اپنی غلط روش کو چھوڑ کر ایک معتدل راہ پر آجاتے تو یہ بھی کچھ معمولی بات نہیں تھی ۔ مگر اس سے بھی زیادہ قابل قدر کام غالب کی اخلاقی اصلاح کا ہُوا ۔ ان کی اس زمانے کی اخلاقی حالت کا ذکر ہو چکا ہے اگر وہ اسی ڈگر پر قائم رہتے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے دل و دماغ کا کیا حشر ہوتا ۔"

(صفحہ ۴۰ ۔ "ذکرِ غالب" (تیسرا ایڈیشن) مطبوعات مکتبہ جامعہ دہلی)

لیکن 'آب و گل' کی یہ 'تضاد پسندی' بھی تاریخ ادب کا ایک دلچسپ موڑ ہے کہ 'خیرآباد' کی اس سرزمین کو جہاں 'فضل حق' جیسی 'غالب ساز' شخصیت کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے ۔ وہیں 'زہرہ اور مشتری' نے بھی جنم لیا جو اپنے زمانے میں غالب کی خاص حریف سمجھی جاتی تھیں ۔

غالب کی زندگی کا آخری دَور اپنی ادبی ہنگامہ آرائیوں کے اعتبار سے ایک اہم زمانہ خیال کیا جاتا ہے ۔ 'قاطع برہان' کی اشاعت کے بعد 'قاطع القاطع' 'محرق قاطع' 'ساطع برہان' اور 'مؤید برہان' کا سلسلہ جو شروع ہُوا تو لکھنؤ کی ادبی فضاؤں میں بھی تموّج پیدا ہوگیا ۔ اودھ میں آتش و ناسخ کا رنگ پہلے سے اتنا چھایا ہوا تھا کہ غالب کے ماننے والے اُنگلیوں پر

گئے جاتے تھے۔ مخالفت کا زور اتنا تھا کہ ریاض خیرآبادی جیسے 'مرنجِ مرنجاں' قسم کے بزرگ نے 'مشقِ سخن' کی ابتدا ہی 'دیوانِ غالب' کے 'جوابی دیوان' سے کی جس کی ایک غزل کے مقطع کا آخری مصرعہ یہ تھا

ہیں ہوں ریاض کچھ اسد دہلوی نہیں

ریاض کے اس دیوان کا لطیفہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ میرے نانا سید ناظر حسین ناظر (وکیل سیتاپور) ریاض کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ ریاض جب غالب کے جواب میں یہ دیوان مکمل کر چکے تو ناظر سے ذکر کیا کہ میں نے غالب کے جواب میں پورا دیوان کہہ دیا ہے کسی دن تمھیں بھی دکھاؤں گا ناظر بڑے ہی پُر مذاق اور بدیہہ گو شاعر تھے۔ بولے! خوب --- آپ اور غالب؟ سبحان اللہ۔ کیا کہنا!

ان کے کلرک منشی چھنّو لال مرحوم وہیں قریب بیٹھے ہوئے مقدمات کی مثلیں ترتیب دے رہے تھے۔ ناظر نے فی البدیہہ کہا

فلک کو دیکھتا ہوں غالب اور ریاض احمد
خدا کی شان ہے ناظر حسین و چھنّو لال

زہرہ اور مشتری اسی خیرآباد (ضلع سیتاپور) کی دو طوائفیں تھیں جنھوں نے غالب کی زندگی میں ان کے خلاف ایک اچھا خاصا ادبی محاذ قائم کر رکھا تھا۔ ان دونوں بہنوں کے تنقیدی مضامین 'اودھ اخبار' وغیرہ میں شائع ہوا کرتے تھے۔ مالک رام صاحب نے ان کا ضمنی تذکرہ 'ذکرِ غالب' میں کیا ہے --- تحریر فرماتے ہیں:۔

"یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی دو رنڈیوں قمرن جان مشتری (عرف منجھو) اور امراؤ جان زہرہ (عرف بی چھوٹی) نے بھی اس معرکے میں حصہ لیا تھا۔ یہ دونوں اچھی خاصی تعلیم یافتہ اور مذکور الصدر آغا علی شمس کی شاگرد تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمس نے خود اعتراض لکھ کر ان دونوں کے نام سے شائع کر دئے تھے۔ پنڈت کشن لال طالب دہلوی نے ان دونوں سے

متعلق بہت سے قطعے لکھے تھے۔ ان میں سے ایک شعر تھا

شارعِ شمس زہرہ مشتری ہے
بڑی تو خیر ہے چھوٹی کھری ہے

(فٹ نوٹ صفحات ۱۳۱ ذکرِ غالب تیسرا ایڈیشن)

"تذکرۂ خمخانۂ جاوید" نے ان مضامین کا اصل مصنف زہرہ و مشتری کے استاد آغا علی شمس کو قرار دیا ہے اور شمس کے ذکر میں لکھا ہے ---

"انھیں دنوں میں آپ (شمس) نے بھی مرزا (غالب) کے خلاف اخباروں میں زہرہ و مشتری کے نام سے مضامین شائع کرائے تھے اور مرزا صاحب کی شاعری پر بھی کچھ اعتراضات کئے تھے مگر چاند پر خاک ڈالنے سے کیا ہوتا ہے۔"

(صفحہ ۳۰۲۔ جلد پنجم)

لیکن 'خمخانۂ جاوید' کا یہ قیاس صحیح نہیں ہے کیونکہ ۲۵ جون ۱۸۶۷ء کے 'اودھ اخبار' (لکھنؤ) میں غالب کے خلاف جو مضمون شائع ہوا تھا وہ آغا علی شمس ہی کے نام سے تھا زہرہ و مشتری کے نام سے شائع کرانے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا جب خود شمس پس پردہ رہ کر معرکہ آرائی کرتے --- مالک رام صاحب نے لکھا ہے:۔

"اسی دوران میں میر آغا علی شمس لکھنوی نے 'اودھ اخبار' (۲۵ جون ۱۸۶۷ء) میں ایک مضمون لکھا جس میں مرزا کے بعض اشعار پر اعتراض کئے تھے۔ اس کا جواب تفتہ نے اردو نثر میں اور باقر نے فارسی نثر میں لکھا۔"

(ذکرِ غالب صفحہ ۱۴۸)

ظاہر ہے کہ آغا علی شمس نے غالب کی مخالفت پس پردہ کی تھی پھر یہ کہنا کہ زہرہ و مشتری کے مضامین شمس کے لکھے ہوئے تھے کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ زہرہ اور مشتری نے یہ مضامین شمس کے ایما اور مشورے سے لکھے ہوں گے۔ اس کے علاوہ جہاں تک ان دونوں بہنوں کی علمی و ادبی قابلیت اور شعری صلاحیتوں کا تعلق ہے پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں بہنوں نے نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی ذاتی قابلیت اور ذہنی صلاحیت کا نمونہ ہیں اور ان میں ان کے استاد شمس کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا اس دور کے کسی

؎ اسی زمانے میں ایک دوسرے سید ناظر حسین ناظر سیتاپوری بھی گذرے ہیں جنھیں ریاض خیرآبادی کی حقیقی بھتیجی منسوب تھیں۔ مشہور مصنف سید رئیس احمد جعفری ندوی انھیں کے صاحبزادے ہیں۔

اُستاد سے اس کے لائق شاگرد کو مل سکتا تھا۔

امام باندی (عرف چھوٹی بی) طوائف کی یہ دونوں لڑکیاں اپنی ماں اور خالہ کے ساتھ بچپن ہی میں خیرآباد سے لکھنؤ چلی گئی تھیں۔ وہیں کی شائستہ محفلوں میں پلی بڑھیں اور وہیں پیوندِ خاک ہوگئیں۔ فارسی اور اُردو کے علاوہ فنِ شعر کی تکمیل میر آغا علی شمس (شاگرد ملک الشعراء خواجہ محمد صادق خان اختر) سے کی جو اپنے دَور کے ایک باکمال بزرگ گذرے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے شمس کی مثنوی 'طلعۃ الشمس' کی ابتداء میں ان کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں۔

"(۱۲۳۲ھ تا ۱۳۱۲ھ)

سید آغا علی نام، شمس تخلص۔ اصل ان کی خراسان سے ہے۔ ابھی کمسن ہی تھے کہ والدین نے انتقال کیا۔ گیارہ سال کی عمر میں راجہ کندن لال اشکی نے ان کو اپنا پسر خواندہ قرار دیا۔ خوشنویسی کی مشق شمس نے انہیں سے کی تھی۔ انھیں کی وساطت سے نواب محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے ان کو رنگین رقم مشکیں قلم (اور) خان بہادر کا خطاب عطا ہوا اور وقائع نگاری کی خدمت سپرد کی گئی۔ کچھ روز تک زمرۂ مصاحبینِ شاہی میں بھی شامل رہے نواب فخرالدولہ زخمی بھی ان کی امیرانہ پرورش کرتے تھے۔ راجہ کندن لال کے بعد عرصہ تک نواب محمد تقی خان شاگرد مرزا سلیم کی سرکار سے توسل رہا لیکن آخر حصۂ عمر ان کا انقلاب زمانہ کے ہاتھوں تنگدستی میں بسر ہوا۔ زہرہ و مشتری مشہور طوائفانِ لکھنؤ کو فارسی پڑھاتے تھے اور انھیں کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ بی مشتری کے نکاح کر لینے اور خانہ نشین ہونے کے بعد کانپور چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ . . . . . . ملک الشعراء اختر کے شاگرد تھے۔ تحقیقِ الفاظ و صحتِ زبان میں کمال حاصل تھا۔ کتبِ درسیہ عربی و فارسی کی تکمیل مولوی فضل حق خیرآبادی، مولوی اوحدالدین بلگرامی، مولوی سبحان علی لکھنوی، مولوی سلامت اللہ کشفی، شاہ عبدالعزیز دہلوی، میرزا قتیل اور مفتی میر عباس سے کی تھی۔ دیوان اردو و فارسی کے علاوہ ان کی ہندی چیزوں کا بھی مجموعہ قابلِ دید ہے۔ گلستانِ سعدی کے جواب میں ایک کتاب 'سنبلستان' لکھی تھی۔"

(طلعۃ الشمس مطبوعہ اردوئے معلیٰ پریس علی گڑھ)

امراؤجان (عرف چھٹن صاحبہ) زہرہ اور بی قمرن جان (عرف منجھو صاحبہ) مشتری لکھنؤ کی ڈیرے دار طوائفیں تھیں۔ ان کی ماں امام باندی کے بزرگوں کی زمینداری میں بمقام سیتاپور آباد تھی لیکن جب اس کی بہن (غالباً خالہ زاد) الٰہی بخش نے خیرآباد کے چکلہ دار سے نکاح کرلیا تو طوائفوں کا یہ خاندان سیتاپور سے خیرآباد منتقل ہوگیا جو اس زمانے میں نوابین اودھ کی نظامت (کمشنری) کا درجہ رکھتا تھا۔ زہرہ و مشتری خیرآباد ہی میں پیدا ہوئیں لیکن بچپن ہی میں انہیں خیرآباد کو خیرباد کہنا پڑا کیونکہ جس چکلہ دار سے ان کی خالہ نے نکاح کرلیا تھا وہ معتوب و معزول کردیا گیا۔ ان دونوں بہنوں کی مکمل تعلیم و تربیت لکھنؤ کی اس علمی و ادبی فضا میں ہوئی جہاں بڑے بڑے شرفاء اپنے بچوں کو علمِ مجلسی سکھانے کے لئے طوائفوں کے گھر بھیجا کرتے تھے۔ درسی تعلیم اور فنِ شعر تو ان دونوں بہنوں نے میر آغا علی شمس جیسے محقق دوراں اور فاضل اجل سے سیکھا۔ موسیقی اور رقص کی ابجد دیکھ حیدر علی قوال اور استاد گھسیٹے خاں نے کی۔ جان عالم نواب واجد علی شاہ کا دورِ حکومت تھا۔ لکھنؤ ہی نہیں دونوں بہنوں کی دھوم ہندوستان میں مچ گئی اور وہ بھی اس شان سے کہ زہرہ و مشتری دو جداگانہ ہستیاں ہونے کے باوجود کچھ اس طرح لازم و ملزوم کردی گئیں کہ آج زہرہ و مشتری کے ذکر میں کوئی تفریق نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی ایک ہی منفرد ہستی کا نام ہے حالانکہ شعرائے اردو و فارسی کے تمام تذکروں میں ان دونوں کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا گیا ہے۔ "تذکرہ بہارستان ناز" جو ان دونوں بہنوں کی زندگی میں چھپا تھا اس میں دونوں کا ذکر موجود ہے۔

"زہرہ — تخلص — امراؤجان نام — بی چھٹن صاحبہ مشہور شعرگوئی میں مشاق — شوخ طبعی میں شہرہ دور دور — میر آغا علی شمس کی شاگرد ہیں اور انھوں نے ہی بنایا ہے 'میرجی' کا شہرہ اظہر من الشمس ہے۔ زہرہ کی زبان کو انھوں نے چمکایا ہے۔ شاگرد اگر اچھا ہو تو فخرِ استاد ہے۔ زہرہ

کی بدولت میاں شمس کی ہر دم سب کو یاد ہے۔ اب بی مشتری کی تحریر سے معلوم ہوا کہ پانچ برس سے اس شاعرہ نے کسی رئیس عالیخاندان سے عقد کر لیا۔ اپنا دامن تر گوہر لٹے توبہ و استغفار سے بھر لیا۔ شعر گوئی کو بھی ترک کر دیا۔ دیکھئے اچھوں کی صحبت نے اچھا ہی اثر دیا۔ خدا کرے چھپ کی عادت نہ اختیار کرے۔ ہمیشہ کے لئے پردہ نشینی ہی اپنا شعار کرے۔"

(صفحہ ۹۴ تذکرہ بہارستان ناز مطبوعہ مطبع عثمانی میرٹھ ۱۲۸۱ھ)

اس کے بعد زہرہ کے اردو کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ دوسری جگہ مشتری کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے:

"مشتری تخلص۔ موسوم بہ قرن جان معروف بہ مجھو لکھنؤ کی رہنے والی۔ شاعری میں خیال بیشانی۔ طبیعت نہایت تیز۔ فکر رسا ہے۔ میاں شمس کی تعلیم یافتہ ہے۔ ماشاء اللہ جیسے استاد کی مشہور طبیعت ہے ویسی ہی زہرہ و مشتری کو شہرت ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب تعلیم میں استاد صاحب اس قدر خیال سے بتائیں تو شاگرد کیونکر نہ گھر گھر شہرت پائیں واقعی یہ کہ حضرت شمس نے ان دونوں کا آتش کو ایسا چمکایا ہے کہ فلک پہ زہرہ و مشتری کا رنگ اڑایا ہے اگر چندے اسی طرح تعلیم پائیں گی تو بی مشتری اپنے تئیں فلک پہ پہونچا دینگی۔ سات برس کی عمر سے اس شاعرہ کو شوق نوشت و خواند ہے۔ یہ ستارہ جلوہ ریزی حضرت شمس سے بڑھتے بڑھتے اب چودھویں رات کا پورا چاند ہے۔ خیر سے سامانِ ظاہری سے درست اور اللہ کی دی ہوئی کچھ جائیداد ہے۔ مسجد۔ امام باڑہ۔ باغ۔ مکان قدیم الایام بمقام خیرآباد ہے۔ اردو فارسی نظم و نثر اور تاریخ گوئی انکی سوا مشق خط خفی و جلی سب میں طاق ہے۔ مگر پیندار میں بھی شہرۂ آفاق ہے۔ غرض ایسے استاد شفیق کے سبب سے فن شعر کا کوئی دقیقہ نہیں باقی ہے۔ وہ کون بزمِ مشاعرہ ہے جہاں شمس و زہرہ و مشتری کی نہیں مشتاق ہے۔ یہ شاعرہ ہر فن میں کامل کیوں نہ ہو اس کا استاد بھی تو صاحب کمال ہے دیکھئے مشتری عطارد رقم کا ۲۳ برس کی عمر میں ایسا ہو جانا استاد کی صاحب کمالی پر دال ہے۔ سبحان اللہ کیا ذہن آسمان پیوند ہے کوئی جھوٹ سمجھے یا سچ۔ ایک کے دل کی دوسرے کو کیا خبر۔ مگر ہمیں تو جی سے اس کا کلام پسند ہے۔ ہاں اس قدر افسوس ہے کہ اس لیاقتِ علمی پر اپنے نزدیک بہت دور ہے۔ جس آدمی میں جوہر لیاقت بھی ہے اور انکسار بھی ہے وہ تو نوراً اعلیٰ نور ہے۔ شعر

بتوں نے حسن پہ نخوت اگر سیکھی تو کب سیکھی
نکو رد ہو گئے بد خصلت اگر سیکھی تو کب سیکھی

مگر یہ جو اس کو نخوت ہے کب خالی از حکمت ہے۔ ہماری رائے میں یہ وہ ٹیکا ہے جس نے نظرِ بد سے اس کو بچا رکھا ہے المختصر جو انداز ہے اچھا ہے اب صفحۂ "بہارستان ناز" اس غنچہ دہن کے اشعار سے گل بداماں ہے۔"

(صفحہ ۸۳ و ۸۴ "تذکرۂ بہارستانِ ناز")

اس کے بعد مشتری کے بھی اردو و فارسی اشعار کا ایک اچھا خاصا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

یہ اقتباس کچھ کم ایک صدی ادھر کے ایک اردو تذکرے سے کیا گیا ہے جو غالب کی حیات میں چھپ چکا تھا۔ اگر دو تین سال ترتیب و تدوین کے بھی شامل کر لئے جائیں تو یہ انداز بیان پورے سو برس ادھر کا ظاہر ہے جس میں جگہ جگہ زہرہ و مشتری ہی پر نہیں ان کے استاد شمس پر بھی چوٹیں کی گئی ہیں۔

اردو اور فارسی کے اکثر و بیشتر تذکروں میں "زہرہ و مشتری" کے مختصر حالات ضرور ملتے ہیں لیکن جتنی بڑی کمی خان بہادر رضا علی وحشت مرحوم نے پوری کی ہے مجھے ابھی تک کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آئی وحشت مرحوم نے ان کے مختصر مگر محققانہ حالات ہی نہیں لکھے بلکہ ان کے بہت سے خطوط بھی فراہم کر کے ماہنامہ 'جادو' ڈھاکہ میں شائع کرا دئے۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ماہنامہ 'آج کل' (دہلی) کے

خطوط نمبر ۱۹۵۵ء میں مشتری کا ایک اردو خط شائع کیا ہے جو انھیں محترمی قاضی عبدالودود صاحب (بیرسٹر پٹنہ) کی وساطت سے پہونچا ہے۔ اسی خط کے سلسلہ میں فاروقی صاحب نے وحشت کے حوالے سے مشتری کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں :-

"مشتری کے متعلق خان بہادر رضا علی وحشت نے لکھا ہے۔ مشتری سیتا پور (ضلع خیرآباد (خیرآباد ضلع سیتا پور صحیح ہے) کی ایک مشہور رقاصہ تھی مگر ہمیشہ لکھنؤ میں رہی۔ نام قمرن جان تھا عرف بی منجھو۔ علم موسیقی میں گھسیٹ خان اور حیدر علی خان قوال کی شاگرد تھی۔ شاعری کا سن شعور سے شوق تھا۔ آغا شمس کی شاگرد تھی۔ مشتری کا ایک دیوان فارسی موسوم "خانۂ خیال" طبع ہوگیا ہے۔ یہ شعر بہت جلد کہتی تھی جب مہاراجہ مہندر سنگھ . . . . والی پٹیالہ لکھنؤ میں آئے مشتری نے سر محفل چند اشعار ـــ مدح میں نظم کئے اور اجازت لے کر ان کو پڑھا۔ مہاراجہ بہت محظوظ ہوئے اور ایک ہزار روپے انعام میں مرحمت کئے۔ آخر میں تائب ہوکر ناچنا گانا چھوڑ دیا تھا اور سید اعجاز حسین اعجاز سے عقد شرعی کیا تھا۔ مرنے کے بعد اس کی تمام جائداد کے مالک ہوئے جہاں حسن و جمال نے اس کے کمالات کو چار چاند لگا دئے تھے۔ صفات حمیدہ نے ـــ عزیزہ خلق کر دیا تھا۔ فن شعر سے جیسا اس کو انس تھا ویسی ہی وہ اہل فن کی قدردان تھی۔ اطراف ہند کے مشاہیر سے روشناس تھی . . . . . لکھنؤ ہی میں نساخ . . . . . . سے اس کا تعارف ہوا اور . . . . . . دونوں کا تعلق بہ درجہ تعشق پہنچ گیا۔

عبدالغفور نساخ نے سخن شعرا میں لکھا ہے (ص ۵۷۹)
مشتری تخلص۔ قمرن جان عرف منجھو طوائف۔ ساکنہ لکھنؤ۔ شاگرد آغا علی شمس۔ خوش طبع و خوش نویس و خوشگوار ہے۔ راقم الحروف سے اس شوخ مجسم سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔"

(ماہنامہ آج کل (خطوط نمبر) اپریل ۱۹۵۵ء صفحہ ۱۰۹)

زہرہ عمر میں مشتری سے بڑی تھی مگر کسی تذکرے سے دونوں کا سن پیدائش معلوم نہیں ہوتا۔ تذکرہ "بہارستان ناز" کی اشاعت (۱۲۸۱ھ) کے وقت مشتری کی عمر ۲۶ سال تھی۔ اس حساب سے مشتری کا سن ولادت ۱۲۵۵ھ نکلتا ہے۔ "مشاہیر نسواں" میں مشتری کا سن وفات ۱۳۱۵ھ لکھا ہوا ہے۔

"مشتری۔ لکھنؤ کی قمرجان عرف منجھو طوائف کا تخلص ہے یہ شاعرہ آغا علی شمس کی شاگرد تھی۔ بڑی اچھی طبیعت پائی تھی ۱۳۱۵ھ میں نذر اجل ہوئی۔"
(صفحہ ۵۱۹۔ مشاہیر نسواں مطبوعہ خادم التعلیم پریس لاہور ۱۹۰۲ء)

گویا بوقت وفات مشتری کی عمر ۶۰ سال تھی۔

مشتری کی ماں امام باندی (وفات ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء)) اگرچہ شاعرہ نہیں تھی لیکن اتنی حاضر جواب، بڑی مذاق اور بذلہ سنج عورت تھی کہ بڑی بڑی محفلوں میں اچھے اچھے منھ کی کھا جاتے تھے۔ محترمی قاضی عبدالودود صاحب نے آغا علی شمس کی "نقل محفل" کے حوالے سے امام باندی کا ایک لطیفہ نقل کیا ہے۔

"بحث تھی کہ آج ایک امام کی شہادت کا دن ہے اور دوسرے امام کی ولادت کا۔ خوش رہنا چاہیئے یا مغموم؟ امام باندی نے بے ساختہ جواب دیا کہ ہنسنا چاہیئے نہ رونا حتی المقدور "شادی مرگ" ہونا چاہیئے۔"

لہ دتاسی کی تاریخ جلد ۲ صفحہ ... ۲ میں مشتری کا ترجمہ درج ہے جو بہارستان ناز مصنفہ رنج سے ماخوذ ہے۔ دتاسی کا بیان ہے کہ ۲۔ جولائی ۱۸۶۹ء کے "اودھ اخبار" میں اس کی ایک غزل بھی چھپی تھی اس نے مشتری کو ساکنہ لکھنؤ شاگرد شمس اور رقیب "زہرہ" لکھا ہے۔

سہ مشتری کے دیوان کا نام "خانۂ خیال" نہیں بلکہ "ترانۂ خیال" ہے میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ "مطبع گلزار محمدی" دیکھا ہے اس پر "ترانۂ خیال معروف بہ "دیوان مشتری" ہی لکھا ہوا ہے۔ "خانۂ خیال" مشتری کے فارسی مجموعۂ نثر کا نام ہے۔ (نادم سیتاپوری)

(صفحہ ۲۳-۲۴: نقل محفل' مطبوعہ گلزار محمدی ۱۳۹۱ھ)

امام باندی' زہرہ اور مشتری کی حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی کے اتنے لطیفے مشہور ہیں کہ اگر انھیں قلمبند کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن ان کی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کی صداقت بھی مشکوک ہو گئی ہے۔

مشہور تو یہی ہے کہ زہرہ و مشتری اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھیں لیکن مجھے اب تک زہرہ کی کوئی فارسی غزل، نظم، رباعی یا قطعات دستیاب نہیں ہو سکے البتہ زہرہ کی اردو غزلیں جا بجا تذکروں اور گلدستوں میں اب بھی بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ مشتری کا فارسی اور اردو کلام تذکروں میں بھی موجود ہے اور کثرت سے شعر و سخن کے گلدستوں میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ مشتری کی فارسی غزلیات کا مجموعہ 'ترانۂ خیال' (معروف بہ دیوانِ مشتری) اور فارسی نثر کا مجموعہ 'خانۂ خیال' بھی ہیں۔ 'ترانۂ خیال' اور 'خانۂ خیال' دونوں مطبع گلزار محمدی (اکبری دروازہ چوک لکھنؤ) میں چھپے تھے۔ ان کے پہلے ایڈیشن میری نظر سے نہیں گذرے لیکن دوسرے ایڈیشن (۱۳۰۱ھ) میرے پیش نظر ہیں۔ مجموعہ نثر فارسی 'خانۂ خیال نثر مشتری' کی ضخامت صرف بیس صفحات ہے۔ آخر میں منشی شنکر دیال فرحت شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر کی ایک فارسی تقریظ بھی شامل ہے۔

ترانۂ خیال (دیوان مشتری) ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ایکسو سے زیادہ غزلیات، قطعات، تضمینیں اور تاریخیں وغیرہ شامل ہیں اور یہ تمام غزلیات وغیرہ مشکل صنعات میں کہی گئی ہیں جو مشتری کے کمالِ فن کی دلیل ہیں۔ مثلاً

۱۔ مہملۃ الکل (ہر لفظ کز نوشتہ خواہد شد از یں حساب عدد 'محمدؐ' بر خواہد آمد)

۲ " " (اس کے ہر لفظ سے 'علی' کے اعداد نکلتے ہیں)

۳۔ ترکِ الف (۴) ترکِ ہائے موحد (۵) ترک فوقانی (۶) ترک مثلثہ (۷) ترک جیم (۸) ترک ہائے بے نقط (۹) ترک ہائے معجمہ (۱۰) ترک تحتانی (۱۱) صنعت فوقانیہ (۱۲) صنعت تحتانیہ (۱۳) صنعت تصحیف (۱۴) صنعت موصل (۱۵) صنعت فشاء (۱۶) صنعت خیفا وغیرہ وغیرہ۔

غزلیات فارسی کا یہ مجموعہ مشتری کے ارتقائے کمال کی ایک ایسی منہ بولتی تصویر ہے جس کی مثال شاید اس دور کی خواتین میں مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔ اس مجموعہ کا قریب قریب نصف حصہ تقریظوں اور تاریخوں پر مشتمل ہے جس میں زیادہ تر تاریخی مصرعوں سے ۱۲۹۷ھ اور ۱۲۹۸ھ نکلتے ہیں۔ دو ایک مادہ تاریخ ۱۲۸۰ ہجری کے بھی ہیں۔ سب سے آخری قطعۂ تاریخ خواجہ عبدالرؤف عشرت مرحوم کا ہے جس سے ۱۳۰۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ تاریخ گو شعراء میں امیر مینائی، داغ دہلوی، مرزا آغا حسن ازل، شیخ انوار حسین تسلیم مرادآبادی، منشی گوبند لال صبا، افضل علی ضو (مالک سید الاخبار) عباس حسین فصاحت (خلف میرآغا حسن امانت) میر غلام حسین قدر بلگرامی (تلمیذ غالب) میرزا عنایت علی بیگ ماہ (برادر مرزا حاتم علی مہر) کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ قدر بلگرامی کے نام کے ساتھ جو عبارت آرائی کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ میرزا غالب کے خلاف جو ادبی ہنگامہ آرائی کی گئی تھی اس پر ذاتیات کی چھاؤں بھی نہیں پڑی تھی۔ قدر کے قطعۂ تاریخ کا سرنامہ ہے ——

"شاہ بیت قصیدہ عظمت و فضیلت۔ مصراع چہارم رباعی شرافت و نجابت۔ بدر و صدر آسمان و ایوان بلند مقالی و نیکنامی قدرؔ جناب مولوی غلام حسین صاحب بلگرامی مرید و شاگرد نواب اسد اللہ خان غالب اکبرآبادی۔ وبرائے مضامین آفرینی را باعث آبادی"

(صفحہ ۶۴ ترانۂ خیال)

سب سے آخری صفحہ پر مطبع گلزار محمدی کے مالک' محمدؐ وزیر' کا ایک اعلان ہے جس میں دوسرے لوگوں کو اس کتاب کی طباعت سے منع کیا گیا ہے۔ اس اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتری کا مکان 'قدیم نخاس' (لکھنؤ) میں تھا۔

مشتری کی فارسی 'انشا پردازی' کا نمونہ 'خانۂ خیال' کے علاوہ بہت سے 'خطوط' بھی ہیں جنھیں خان بہادر رضا علی وحشت مرحوم نے جمع کرکے چھپوائے ہیں۔ لیکن ان مطبوعہ خطوط کے علاوہ بھی مشتری اور زہرہ کے بہت سے خطوط گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ حال میں مجھے ان کے دو غیر مطبوعہ فارسی خطوط کی نقلیں برادرم مولوی نجم الحسن خیرآبادی کے توسط سے دستیاب ہوئی ہیں جو

کسی خیرآبادی بزرگ' کو لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط پر نہ کوئی تاریخ ہے نہ مکتوب الیہ کا نام۔ صرف سیاق عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'زہرہ و مشتری' کے یہ خطوط ان کے کسی ہم وطن ہی کے نام ہیں۔ پہلے خط میں کسی مقدمہ کا ذکر ہے جو ان کے موروثی باغ کے سلسلے میں چل رہا تھا۔

باسمہ سبحانہٗ

دام اقبالہ و اجلالہ۔ خوب شد کہ بہ ترمیم شکست و ریخت غریب خانہ بطور یکہ سر دست مناسب بود ہمت عالی گماشتند۔ و مرمت کلی بر فصل زمستان کہ بشرط خیریت زود تر می رسد۔ گزاشتند شکایت بدگمانی من نسبت خود عبث خود از خامہ رافت بار چکیدہ خدا نخواستہ این نفس ہیچ در ہیچ بیا بیابان، ورنہ دل نزدیک کسے صادر و وارد گردیدہ۔ خلاصہ تحریر سابق این بودہ است کہ درستی کار ہائے ما ہرگز ارسش ما منحصر و موقوف نباشد بلکہ ہرچہ مقتضائے وقت و محل نماز از ان مربی ملطف و مالک برحق۔ رنگ ظہور باشد۔ حال مقدمہ مرجوعہ عدالت مفصل بہ نگارند و این ہم کہ بہ باغ مرہونہ قبض و دخل ضابطہ یافتہ بہ تحریر آرند وارسال نسک مطلوبہ از ین جہت در التوا افتادہ کہ وارث قرض خواہ از ینجا یا براہ سفر کانپور ستادہ۔ واجب دانستہ عرض نمود۔ زیادہ فرصت نبود۔

سعدین۔ زہرہ مشتری

اختر آسمان ریاست — و فیض رسانی گوہر دریائے امارت و قدردانی دام اقبالہٗ

والا نامہ مکرمت مشحون۔ مرحمت مقرون۔ تاج سر ورود۔ شفقت آمود گردید و مضمون آن از اول تا آخر آبرو بخش ذہن ناقص ما بہ بیاقت گشت۔ کنیز پروری و پرستار نوازی کہ از غلامان جناب نسبت این کمترینان بظہور رسید۔ شایان ولی نعمتی و سزاوار خداوندان بود۔ شکر احسانات بے پایان از حوصلہ تحریر و اندازہ تقریر بیرون و افزونست ایزد بسیار بخش بجلدوی چنیں مراحم و تفضلات جناب والا را حشمت و اقبالے کہ مافوق آن متصور نباشد عطا فرماید۔ بجناب پاک ہرچند خواستیم کہ آستان فیض نشان بہ لبہائے ارادت و عقیدت ببوسیم۔ لیکن امور یکہ سنگ راہ مقصود شد۔ بیانش درین پارچہ قرطاس نمی تواند گنجید۔ ان شاء اللہ بعد محرم حاضر گشتہ آن قصہ طویل را بہ سمع اقدس خواہیم رسانید آمدیم بر اینکہ اسباب و صرف ضروری بدست میر نجف علی صاحب فرستادیم ایشان حسب معمول قدیم بجا آوری مراسم عزاداری حتی المقدور خواہد پرداخت لیکن آنجناب براہ عنایات مربیانہ یک آدم ہوشیار بطور مددگار بہ امام باڑہ تعینات نماشند تا وقتیکہ میر صاحب بمجالس دیگر روند۔ آدم مذکور نگہبانی فرش وغیرہ بہ عمل آرد۔ و فروخت فصل انبہ وغیرہ باغ و خالی نماندن ہر سہ دکان از کرایہ دار ہرگز خاطر دریا مقاطر باشد بلکہ تا فروخت شدن فصل یک دو 'پاسی' معتبر از طرف جناب عالی محافظ باغ شود۔ و باغ جدید کہ تصدق فرق مبارک است۔ در نیبو ریا نشاندہ شود۔ و سبزہ کنیزکہ بے اجازت و اطلاع ما آنجا رفتہ ہرگز در مسجد و امام باڑہ و غریب خانہ راہ نیابد زیادہ سوائے این رباعی چہ گزارش دہم۔

اے آنکہ ترا لطف و عطائے زیبد
مارا گنہ و جرم و خطائے زیبد
زنہار نگویم کہ چنان کن و چنیں
با حسن تو ہمان کن کہ ترا می زیبد

بخدمت سراسر عظمت حاشیہ نشینان بساط عزت مناط قبلہ و کعبہ جہان مخدوم و مسجود زمان حضرت فرشتہ خصلت جناب متولی صاحب مدظلہ آداب و تسلیم قبول باد

"زہرہ و مشتری"

ان دونوں خطوط سے ان کی وطنی وابستگی کا اچھا خاصہ ثبوت ملتا ہے۔ لیکن آج اسی "خیرآباد" میں ان کے مکان کا تو ذکر ہی کیا 'مکین' کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں۔

مرزا جعفر حسین

مرزا غالب کا فارسی کلام

تقریباً سو سال کے اندر جتنا مطالعہ غالب کا کیا گیا ہے، کتابیں، مضامین، رسائل، تحقیقاتی مقالے اور عقیدت مندانہ خراج تحسین یا مخالفانہ نقد و تبصرہ سے بھرے ہوئے دفتر تیار کئے گئے ہیں اتنا کسی اور کے بارے میں نہیں لکھا گیا اور نہ کوئی دوسرا شاعر یا ادیب اتنا بڑا مرکز توجہ بن سکا۔ اس کی وجہ بقول پروفیسر احتشام حسین یہ ہے کہ "لوگ دوسروں کی کاوشوں کو اپنے لئے بہ قدرِ ذوق نہیں پاتے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ لوگ غالب کو اپنے آئینہ میں اور غالب کے کلام کو آئینہ بنا کر اس میں اپنی شخصیت کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے اس کا بیشتر حصہ مرزا کے بے حد مختصر اردو دیوان سے متعلق ہے جس کو وہ خود "بیرنگ من ست" کہہ کر سبک کر چکے تھے۔ ان کو اگر اپنے کلام پر ناز تھا تو فارسی کلام پر جس کا اچھا خاصا ضخیم کلیات ہمارے پاس موجود ہے مگر ہم نے اس پر آج تک اتنی توجہ نہیں کی جس کا وہ مستحق ہے۔ مرزا کی اس کلام کے متعلق جو اپنی رائے ہے وہ ان دو شعروں سے واضح ہو جاتی ہے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من ست
فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال　　مانی و ارژنگم و آن نسخہ ارتنگ من ست

مرزا کے اسی قول سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے فارسی دیوان کو ارتنگ کا مرتبہ دے کر اقلیم خیال میں اپنے کو مانی و ارژنگ کا ہم پلّہ قرار دیتے تھے۔ ان کا فارسی کلام ان کے اس قول کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

یہ سچ ہے کہ مرزا کی مادری زبان فارسی نہیں تھی، ان کا ماحول ایرانی نہیں تھا۔ طبیعتاً بھی وہ "کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلےٰ" کے شیدائی نہیں تھے۔ شیراز و اصفہان اور سمرقند و بخارا کی یادیں اگر ان کے دل میں موجزن ہوتی بھی تھیں تو صرف اس لئے کہ ہندوستان کے بہشت میں ان کے لئے آدم کا وجود عنقا تھا وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ

سخن نیست در لطف این قطعہ غالب
بہشتے بود ہند کآدم ندارد

اپنے معاصرین میں ان کو انسانیت اور انسانی ہمدردی کا اتنا فقدان محسوس ہوتا تھا کہ وہ یک لخت آدمیوں کی صورت سے ڈرنے لگے تھے اور آدمیوں سے دور رہنا چاہتے تھے۔ اس خیال کا اظہار انہوں نے متعدد بار اور طرح طرح سے کیا ہے۔ اس مقام پر صرف ایک اردو اور ایک فارسی شعر پیش کر دینا کافی ہوگا۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ　　ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مرا ز روزِ قیامت غمے کہ ہست این ست　　کہ روئے مردم دنیا دوبارہ باید دید

مردم گزیدگی سے تکلیف کا اظہار غالباً ان دو طریقوں سے بہتر کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن اپنے بھائی بندوں کے ہاتھوں جو تکلیفیں اٹھائی تھیں ان کے احساس کے باوجود مرزا کے دل میں ہندوستان کے شہروں، ہندوستان کے میووں اور ہندوستان کے پانی سے وہ محبت تھی کہ وہ "کنار آب رکنا باد" کو سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ آم

سے اُن کو عشق تھا اور اس ہندوستانی پھل کو وہ جنت کے میووں پر ترجیح دیتے تھے۔ کہتے ہیں:

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد
غالب آن انبۂ بنگالہ فراموش مباد

ہندوستان کے پانی میں دریائے سون سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ متعدد مقامات پر دریائے سون کا ذکر آیا ہے اور اس کے پانی کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے ہر مقام پر لفظ سوہن استعمال کیا ہے مگر پڑھنے والا یہی سمجھنے پر مجبور ہے کہ ان کی مراد دریائے سون ہی ہوگی۔ کہتے ہیں:

مرحبا سوہن و جاں بخشی آبش غالب
خندہ بر گوہر خضر و سکندر دارم

ہندوستان کے شہروں کا جب وہ ذکر کرتے ہیں تو ان کے اندازِ کلام ہی سے ان کے دل کی گہرائیوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ ایک فارسی قطعہ میں "محرم سرائے سرور" سے مکالمہ ہوتا ہے۔ یہ "محرم سرائے سرور" مرزا کی روح ہے۔ اس مکالمہ میں مختلف شہروں کے بارے میں سوالات ہیں اور ان کے جوابات۔ ان جوابات ہی کو دیکھ کر مرزا کے جذبات کا صحیح پتہ چل جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

گفتم اکنوں بگو کہ دہلی چیست — گفت جان ست و این جہانش تن
گفتمش چیست این بنارس گفت — شاہدے ہست محو گل چیدن
گفتمش چوں بود عظیم آباد — گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوشش باشد — گفت خوشش تر نہ باشد از سوہن
حال کلکتہ باز جستم گفت — ہا بد اقلیم ہشتمش گفتن

الخ

ان اشعار کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مرزا ہندوستان کے ماحول اور یہاں کے روایات میں آشنا ڈوب چکے تھے کہ ان کو بیرونی ماحول اور کیفیات سے متاثر ہونے کی ضرورت ہی باقی نہ تھی اس لئے ان کے فارسی کلام کے محاسن اور زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جا سکتی کہ فارسی شعراء میں مرزا جن اساتذہ سے متاثر ہوئے وہ وہی شعراء تھے جو ہندوستان میں آکے بس گئے تھے اور جنھوں نے ہندوستان ہی کو اپنا گھر بنا لیا تھا جیسے نظیری، ظہوری، عرفی اور بیدل۔

ان اساتذہ سے لگاؤ اور ایرانی ماحول سے فطری دوری کا یہ اثر ضرور ہوا کہ مرزا کے یہاں حافظ و خیام کی سرمستی و چاشنی، سعدی کی سادگی، فردوسی کی ایسی رفعتِ خیال، قاآنی کا شکوہِ الفاظ، انوری کا لب و لہجہ اور دوسرے خالص ایرانی شاعروں کے وہ خصوصیات جو ایرانی ماحول و وراثت سے متعلق ہیں بہت کم ملتے ہیں لیکن پھر بھی مرزا ہی کا یہ دم خم تھا کہ انھوں نے ان خصوصیات کو بھی حاصل کر کے چھوڑا اور پھر ان لسانی اور وجدانی خصوصیات میں تفکر و تعقل کی گہرائیوں، حسن عشق کی معاملہ فہمیوں، تصوف کی محو کر دینے والی منزلوں، انسانی کردار کی بلندیوں اور انسانی جذبات کی صحیح ترجمانی کے معیار کو شامل کر کے اپنے فارسی کلام میں وہ چار چاند لگا دیئے جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے یہاں ملنا بہت مشکل ہے۔

مرزا نے اپنے ابتدائی مشقِ سخن میں بیدل کی تقلید کرنا چاہی تھی۔ چنانچہ اُن کے اردو دیوان میں بہت سے ایسے شعر ملیں گے جو بیدل کے رنگ میں کہے تھے۔ فارسی میں بھی اس کے بہت سے نمونے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا اور بیدل کی ایک ہم طرح غزل کے کچھ شعر پیش کئے جاتے ہیں:

برطرف منظر کردیم ہم بخود سفر کردیم
اے محیط حیرانی این چہ بیکرانیہاست
ما ز سیر این گلشن عشوۂ طرب خوردیم
ورنہ چشم واکردن عبرت امتحانیہاست
ساز ما شکست دل یار ازین نوا غافل
ہر کہ پیش خود نالیم نالہ بیزبانیہاست
بیدل

در کشاکش ضعفم نگسلد روان از تن
اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہاست
از خمیدن پشتم روے بر قفا باشد
تا چہا درین پیری حسرت جوانیہاست
کشتہ دل خویشیم کز ستمگران یکسر
دیدہ دلفریبیہا گفت مہربانیہاست
با عدو عتابستے وز منش حیا بستے
وہ چہ دلربانیہاست چہ جانستانیہاست
غالب

ان اشعار کا موازنہ ثابت کر دے گا کہ بیدل کی تقلید کرنے کے باوجود مرزا کی انفرادیت ثابت ہے اور ان کا وہ طرز جو آگے بڑھ کر خود انھیں کا اندازِ سخن کہلایا اور بن گیا اس کلام میں بھی موجود ہے۔ ورنہ دلفریبیوں کو مہربانی کہنے، نہ مرجانے کا سبب ناتوانی کو قرار

ویسے دینے اور پیری میں حسرت جوانی کا نمونہ پیش کرنے کی ترجمانی نہ ہوتی۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں مرزا غالب آپ اپنی مثال ہیں اور کوئی دوسرا ان کا ہم پلہ یا بدِمقابل نظر نہیں آتا۔

مرزا کی فطری صلاحیتوں میں ان کے مطالعے اور دقیقہ سنجی نے بھی اضافہ کر دیا تھا۔ مرزا نے اگر بیدل کی تقلید کی تو اسی ایک زاویۂ نگاہ کے وہ پابند نہیں رہے۔ انھوں نے ہر اُس شاعر کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا جس کو وہ اساتذہ کی صف میں جگہ دینے کے لئے تیار تھے اور ہر ایسے استاد سے کچھ نہ کچھ اکتساب کی جدوجہد بھی کی تھی۔ چنانچہ اپنے فارسی کلیات کی تقریظ میں وہ خود لکھتے ہیں:

"شیخ علی حزیں بخندہ زیر لبی بیراہ روی مرا در نظرم جلوہ گر ساختند۔ وزہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبش ہائے ناروا در پائے رہ پیمائے من بسوخت۔ ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس حرزے بہ بازوے و توشۂ بر کمر بست و نظیری لاا بالی خرام بہنجار خاصہ خودم بجا لش آورد۔ اکنوں بہ یمن فرۂ پرورش آموختگی این گروہ فرشتہ شکوہ کلک رقاص من بجز امش نہ رو ست و برامش موسیقار بجلوہ طاؤس ست و بہ پرواز عنقا۔"

متذکرہ بالا بیان کا دقیق مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ مرزا کی نگاہ میں شیخ علی حزیں اور طالب آملی کے مقابلہ میں ظہوری اور نظیری کا پلہ بھاری تھا اور عرفی کا مقام ان دونوں کی منزلوں کے درمیان ہیں۔ اس وضاحت کا ثبوت خود مرزا کے اشعار سے بھی مل جاتا ہے۔ عرفی کے بارے میں لکھتے ہیں:

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب — جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

قافیہ غالب چو نیست پس ز عرفی — گر من فرہنگ بودے چہ غم

گشتہ ام غالب طرف با مشرب عرفی کہ گفت

روے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

ان اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا اپنی 'طینت' میں 'کیفیت' عرفی کا اکتساب اور الفاظ کی بہتات میں عرفی سے فیض حاصل کرکے 'مشرب عرفی' کے ہم نوا بننا چاہتے تھے اور اس ہم نوائی کو حاصل کرنے کے بعد بھی ان کا کلام یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ہر جگہ اپنے مخصوص ذوقِ فکر اور طرزِ ادا کو برقرار رکھتے ہوئے عرفی سے ٹکر لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ شعر عرفی اور غالب کے دونوں کی علٰحدہ علٰحدہ "طینت" اور طرزِ خیالی کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں:-

صبحدم چوں در د مد دل صور شیون زائے من
آسماں صحنِ قیامت گردد از غوغائے من

(عرفی)

زاں نمی ترسم کہ گردد قعرِ دوزخ جائے من
وائے گر باشد ہمیں امروزِ من فردائے من

(غالب)

اقبال کرم میگزد ارباب ہمم را
ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را

(عرفی)

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را
خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

(غالب)

یہ دونوں مطلع قصائد کے ہیں۔ عرفی اور غالب کی ایک ہم طرح غزل کا موازنہ بھی اس مقام پہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اس لئے کہ دونوں کا مخصوص طرزِ ادا اور دونوں کے سوچنے اور اظہارِ خیال کے رجحانات اسی ایک غزل سے واضح ہو جائیں گے۔

جنگ آتش آشتی آتش مدارا آتش ست
خوش سرو کازاں ید خوم را با آتش ست
بادہ خواہی باش تا از غم بزں آرم کہ من
انچہ در جام و سبو دارم ہمہ آتش ست
آب حیواں می کنم در جام و آتش میخورم
باد با شاہد مے ناب ست و تنہا آتش ست
ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحون عشق
روے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست
با کہ گویم مر ایں معنی کہ نو تحسین دوست
با دماغ من گل و با چشم ما آتش ست

(عرفی)

سینہ بکشودیم و خلقے دید کاینجا آتش ست
بعد ازیں گویند آتش را کہ گویا آتش ست
انتظارِ جلوۂ ساقی کباب می کنند
مے بہ ساغر آبِ حیوان و بمینا آتش ست
بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روے دریا آتش ست
گریۂ دارم کہ تا تحت الثریٰ آب ست و بس
نالۂ دارم کہ تا اوجِ ثریا آتش ست
پاک خورم امروز و زنہار از پئے فردا مترس
در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش ست

(غالب)

عرفی سے اکتساب فیض اور پھر اس فیض میں جدت آفرینی مرزا کا طرۂ امتیاز تھا جو اوپر کی دونوں غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہی حالت اور دوسری غزلوں کی بھی ہے جو مرزا نے عرفی کی طرحوں میں کہی ہیں۔ عرفی کے علاوہ مرزا نے نظیری اور ظہوری سے بھی برابر کی ٹکر لی ہے۔ ہو سکتا ہے

کہ ہر مقام پر مرزا کا پلّہ بھاری نظر آئے لیکن جہاں تک بلندیٔ فکر، جذبات نگاری، حقیقت کی بے نقابی اور ایک اعلیٰ کردار پیش کرنے کا تعلق ہے اس میں مرزا کا مرتبہ کسی طرح بھی ان شعراء سے کم نہیں ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مرزا نے ان دونوں اساتذہ کے کلام کا بغور مطالعہ کیا تھا اور ان دونوں شعراء کے کردار کو بھی اچھی طرح سمجھا اور پرکھ لیا تھا۔ ظہوری کی طبیعت مرزا کی طرح دقیقہ سنج تھی۔ دونوں کے یہاں ندرتِ خیال کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں، انسانی کردار کا معیار دونوں کی نظر میں یکساں طور پر بلند تھا اور خواہشات و جذبات کی ترجمانی میں دونوں ہم آہنگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا نے ہر مقام پر ظہوری کا احترام ملحوظ رکھا ہے اور بڑے بلند الفاظ میں ان کو یاد کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں:-

غالب از جوشِ دم ما تیغ تیش گلپوش باد | پیروۂ سازِ ظہوری را گل افشاں کردہ ایم

غالب از اوراقِ ما نقشِ ظہوری دمید | سبزۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدار دہیم

غالب از من شیوۂ نطقِ ظہوری زندہ گشت | از نوا جان در تنِ سازِ بیانش کردہ ایم

ز تربیت از ظہوری باش غالب بحث چیست | در سخن درویشی باید نہ دکان داریئے

بنظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب | رگِ جاں کردہ ام شیرازہ اوراقِ کتابش را

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ مرزا کا طرزِ ادا اور ان کی ندرتِ خیال جس طرح آپ اپنی مثال ہے وہی حالت ان کی انفرادیت کی بھی ہے جو ظہوری کو قابلِ احترام سمجھنے کے بعد بھی ان کی ہر سطر میں جھلک رہی ہے۔ مثال کے طور پر لیجئے۔ ظہوری نے "آستانش را" اور "پاسبانش را" کی ردیف اور قوافی میں غزل کہی ہے۔ مرزا نے اپنی طبع آزمائی کے لئے قافیہ بدل کے راہ نکالی۔ دونوں کی ہم بحر غزلوں کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:-

شب از مژگان تر رفتم غبارِ آستانش را | پریدم دوزخ و آں داغہا سینہ نازش را

پشیمانم کہ کارے یاد دادم پاسبانش را | سراپے بود در رہ تشنۂ برقِ عتابش را

فگندی بستونے کاش پیشِ سخت جانی خود | ندانم تا چہ برق فتنہ خواہد ریخت بر تو تم

کر دیدی با وجودِ ناتوانیہا توانش را | تصور کردہ ام گستنی بندِ نقابش را

بجادہ عشق با سرمایۂ دارم سرِ سودا | سرا رتوسن نازست و بر خاکم گزر دادی

کہ صد جان ست قیمت یک نگاہِ رائگانش را | ببالِ آرزو چنداں کہ دریابی رکابش را

جبیناں چوں رسم بر مسند تعظیم ننشینم | خیالش صید دام پیچ و تاب شوق بود اما

کہ بلبل بگذرد از پیشِ من در بوستانش را | من از مستی غلط کردم بشوقی ضبط نالش را

(ظہوری) | (غالب)

اسی طرح مرزا نے یہ بھی ستم ظریفی کی ہے کہ بعض مقامات پر بحر بدل کے اور کہیں ردیف میں فرق کر کے ظاہری سے تکرار لی ہے اور اپنی انفرادیت کو پوری طرح ظاہر کر دیا ہے۔ مثال میں دو غزلوں کے چند شعر پیش ہیں۔ پہلی غزل میں صرف ردیف کا فرق ہے۔

از دمِ تیغ نگاہ تن بہ تپیدن دہیم | سوختہ جگر تا کجا رنج چکیدن دہیم

مژدۂ حیرت کشم دیدہ بہ دیدن دہیم | رنگ شو اے خونِ گرم تا بہ پریدن دہیم

از روشِ جلوہ آہ بیراہ افگنم | جلوہ غلط کردہ اند زرخ بکشا تا ز مہر

وز خلشِ غمزہ خون بچکیدن دہیم | ذرہ و پروانہ را مژدۂ دیدن دہیم

بند نقابی کشم تیغ و ترنج آوردم | سبزۂ ما در عدم تشنۂ برق بلاست

یوسف و یعقوب را کف ببریدن دہیم | در رہِ سیل بہار شرح دمیدن دہیم

توبہ پرہیز را کردہ شکستی درست | شیوۂ تسلیم ما بودہ تو اے خنجِ طلب

محضرِ ناموس را زیب دریدن دہیم | در خمِ محراب تیغ تن بخمیدن دہیم

آمدہ زہ دیک لب حرف کے دور نیست | خیز کہ راز درون در جگر نے دہیم

کہ بن ہر موئے را گوش شنیدن دہیم | نالۂ خود را ز خویش داد شنیدن دہیم

(ظہوری) | (غالب)

دوسری غزل میں بحر کا فرق ہے۔ مگر اس فرق کے باوجود مرزا کو ظہوری کی تاسی کا احساس تھا اسی لئے مقطع میں اس کو یاد کر لیا

"ز تربیت از ظہوری باش غالب بحث چیست
در سخن درویشی باید نہ دکاں داریئے"

اب دونوں کی غزلیں ملاحظہ ہوں:

عرہ تم شد عرہ تے از خواریئے
گشت آساں بود گر دشواریئے
مژدہ از من بخت خواب آلودہ را
بستہ ام افسانۂ بیداریئے
در زمین سینہ کشتم تخمِ داغ
دار وابر دیدہ اخگر کاریئے

کافرم گر از تو باور باشدم غمخواریئے
آزمند اندہ تم کردہ ذوقِ خواریئے
از کنار دجلہ قتش خاز چنداں دور نیست
کشتیٔ ما بر شکستنی دو دستاں باریئے
شاد باش اے غم زبیم مرگ امیے ساختی
گشت صرف زندگانی بودگر دشواریئے

از برائے صبر نافرمان خویش
می نویسم نامۂ بیزار ایئے
آرزوئے یاریٔ دارم زیار
کاش می آمد ز من اغیار ہیئے
بیلا ام درخوشی ز ہائے غیر
عشق وارد نیز دنیا داریئے

(ظہوری)

برق از نہرت کباب ہیجا با سوزیئے
مرگ از لطلمت ہلاک و دو منتا زاریئے
با خرد گفتم چہ باشد مرگ بعد از زندگی
گفت بے خواب گرانے از پس بیداریئے
اے دل از مطلب گزشتم وز شکایت راچہ شد
شیوۂ شورے فغانے اضطرابے زاریئے

(غالبا)

ظہوری کے مقابلے میں نظیری کی ہم طرح غزلیں مرزا کے کلام میں زیادہ تعداد میں ملتی ہیں۔ اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ مرزا اگر ایک طرف ظہوری کے تعمقِ فکر اور ندرتِ خیال سے متاثر تھے تو دوسری طرف نظیری کے لطافتِ بیان اور حسنِ ادا کے بہت زیادہ دلدادہ تھے۔ نظیری نے حسن و عشق کے معاملات جس لطیف پیرایہ میں بیان کئے ہیں اس کی مثال دوسری جگہ کم ملتی ہے۔ مرزا نے اس باب میں نظیری کی تاسی کرنے کی بے حد کوشش کی ہے۔ بعض مقامات پر وہ نظیری کے ہم پلّہ بھی نظر آتے ہیں لیکن ان کی یہ جدوجہد بسا اوقات اس لئے ناکام رہی کہ ان کی دقیقہ سنج اور مشکل پسند طبیعت نظیری کے لطافتِ ادا اسلوبِ سخن کو قبول نہ کر سکی۔ اس کا احساس خود مرزا کو بھی تھا اور وہ کہا کرتے تھے کہ

"جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب   خطا نمودہ ام و چشمِ آفرین دارم"

اس شعر کا دوسرا مصرع بھی نظیری کا ہے۔ اس مقام پر مرزا غالب اور خواجہ نظیری کی بعض ہم طرح غـــزلوں کا موازنہ ان دونوں اساتذہ کے علٰحدہ علٰحدہ رجحانات الگ الگ اسلوبِ سخن اور بالخصوص مرزا کی انفرادیت کو ثابت کرنے کے لئے کارآمد ہوگا۔ ایسی تین غـــزلوں کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

کجا بودی کہ امشب سوختی آزردہ جانے را
بفقدیر روز محشر طول دادی ہر زمانے را
سوالے کن ز مسیا مروزنہ تا خوغاۓ شہر افتد
کہ اعجاز فلانے کرد گویا بے زبانے را
کتاب سفت ملت گر بخوانند آدمی ملیت
نخوانند تا ز جزو آشنائی داستانے را

بہ بایانِ محبت یاد می آرم زمانے را
کہ دل عہد وفا نابستہ دام داستانے را
فسونے کو کہ بر جانِ حزیے دل بدرد آرد
بد اندیشے با مزدہ عزیزان شادمانے را
ندارم تاب ضبط از دمی ترسم ز رسوائی
مگر جویم ز بہر ہمزبانی بیزبانے را

ہر چشمے کہ می گیرند اخلاص وفا عیب ست
پس از عمرے گزر افتاد بیرا کاروانے را
دلا سیلابِ خوں را از شگافِ سینہ بیروں کن
کہ امشب سودہ ام بر دیدہ خاکِ آستانے را
نمی دانم نظیری کیست چوں می آمدم زاں کو
محالِ مرگ دیدم بر سرِ رہ ناتوانے را

(نظیری)

بیا در گلشن بخت کہ در ہر گوشہ بنمایم
ز جوش لالہ و گل درحنا پاسے خزانے را
کمال دزد دل اصل ست در ترکیب انسانی
بخوں آغشتہ اند اندریں ہر موۓ جانے را
بہ شہر از دوست بعد از روزگارے یافتم غالب
ز عنوان خطے کز راہ دور آمد نشانے را

(غالب)

ظاہر ہے کہ نظیری کی غزل بہت بلند ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ نظیری کی یہ غزل اس کی بہترین غزلوں میں سے ہے اور حسن و عشق کی معاملہ بندی جو نظیری کا طرۂ امتیاز ہے اس غـــزل میں معراجِ کمال پر ملتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مرزا کی غزل صرف ندرتِ خیال اور دقیقہ سنجی کی بہترین مثال کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ اب دوسری غزل ملاحظہ ہو:

کس نہ نمود جرعہ کز جام گزک نخواستست
بے نمکی ز گفت کس کز سخنم نمک نخواستست
رنگِ رخ سخن نشان مے ببہا ز عیار مرد
صاحبِ فہم خورد بیں تا سزا محک نخواستست
گفت شنید دوستاں مایۂ عیش می شود[ث]
آنکہ شمرد دو نفس ہمدمی ملک نخواستست
من ہمہ عجز و مہکناں میل نزاع می کنند
ہر کہ حریف باف شد عاقلا ز دخسک نخواستست
عالم و یک مسیح دم دیرنخاں و یک صنم
ہر چہ نخواستے ز ما سی اختر نہ فلک نخواستست
مصرع نظم بغلط صفر و نثر بے نقط
لنو و نظم و نثر من نقطۂ سہو و شک نخواستست

(نظیری)

ہر چہ فلک نخواستست ہیچکس از فلک نخواستست
ظرف فقیہ می نجست بادۂ ما گزک نخواستست
جاہ ز علم بیخبر علم ز جاہ بے نیاز
ہم محک تو زر ندید ہم زر ما محک نخواستست
زاہد و ورزش سجود آہ ز دعویٔ وجود
تا نزد اہرمن زنش بدر رقہ ملک نخواستست
بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں
کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواستست
گشتہ و از تنگنا پرورد دیدۂ پیررہ سفید
دررہ شوق ہمرہی دیدۂ مردمک نخواستست
ریز ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نبود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواستست

(غالب)

ان غزلوں کا موازنہ مرزا ہی کو خیال، اسلوبِ سخن اور طرزِ ادا میں نظیری سے بہت بلند بتاتا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں بھی

ث عیش می بود

مضمون آفرینی، دقیقہ سنجی اور ندرتِ خیال کی منزل آجائے مرزا بڑے سے بڑے استادانِ فن کے دوش بدوش کھڑے ہو جانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ آئیے اب ایک اور ہم طرح غزل کا موازنہ کر لیا جائے:

ما حالِ خویش بے مژہ پا نوشتہ ایم
روزِ فراق را شبِ یلدا نوشتہ ایم
قاصد بہوش باش کہ بر یک جواب تلخ
عرضِ ہزار گونہ تمنا نوشتہ ایم
رُوئے نکو معالجۂ عمر کوتہ است
این نسخہ از علاجِ مسیحا نوشتہ ایم
ہر گہ کہ مردہ ایم روانِ کشتئ امید
طوفانِ بادِ شورِ بہ دریا نوشتہ ایم
تحقیقِ حالِ ما زنگہ می تواں نمود
حرفے ز حالِ خویش بسیما نوشتہ ایم

(نظیری)

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم
عنوانِ رازِ نامۂ اندوہ سادہ بود
سطرِ شکستِ رنگ بسیما نوشتہ ایم
در ہیچ نسخہ معنیٔ لفظِ امید نیست
فرہنگ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم
آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم
کوتہ زنقشِ جبہۂ مایک قلم بپُرست
نخہ سپاسِ ہمدمیٔ پا نوشتہ ایم

(غالب)

ان اشعار سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ مرزا کا پلہ اگر اونچا نہیں تو نظیری سے ہلکا بھی نہیں ہے۔ ایک مختصر مضمون میں اتنی گنجائش کہاں کہ اساتذہ کے کلام کا دل کھول کے موازنہ کیا جا سکے۔ تاہم اربابِ ذوق کی تسلی جستجو کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ مرزا اور نظیری کے موازنہ کے لئے "مکتبہا، نشترہا"، "بلا خفتنت، کہ خفتنت"، "عربیت، بےادبیت"، "کام ندارد، انجام ندارد"، "جشیرہ گیرد، نہ دو نگیرد"، "پاکش نگر، پاکنش نگر"، "امتحاں برخیز، امتاں برخیز"، "بازکردن، دراز کردن"، "سخن خواہد شدن، برہمن خواہد شدن" کے ردیف و قوافی والی اور اسی قبیل کی دوسری ہم طرح غزلوں کا مطالعہ ادبی شوریٰ تشنگی دور کرنے کے لئے کافی ہوگا اور اگر عرفی، ظہوری، نظیری، بیدل اور غالب کے ایسے باکمال اساتذہ کو ایک ہی صف میں دیکھنا مقصود ہو تو "بآتش ست، مدارا آتش ست"، "خود مندست، پندست"، "بسل فتادست، قاتل افتادست"، "وضو کنند، سبو کنند"، "تا بشتہ ایم، آب شستہ ایم" کے ردیف و قوافی والی

معرکۃ الآرا غزلیات میں تلاش کر لیجئے۔ ایسے موازنے کے بعد مرزا کے اصلی خد و خال واضح ہو جائیں گے اور ہم یہ کہنے میں بجا طور سے فخر حاصل کر سکیں گے کہ ہم اپنے صرف ایک ہندوستانی شاعر کو بڑے بڑے ایرانی اساتذہ کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں جو ان سب کا فرداً فرداً اور اجتماعی طور سے بھی شاعری کے جملہ محاسن میں پوری طرح مدِ مقابل بن سکتا ہے۔

آئیے اب ذرا مرزا غالب کی انفرادیت کا بھی جائزہ لیا جائے۔ مرزا کے سوچنے کا طریقہ اور اپنے مخصوص رجحانات کو اپنے مخصوص انداز بیان میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی اُن کی آپ مثال ہے۔ ان کے اردو اشعار زبان زد خلائق ہیں لیکن فارسی میں بھی اچھے اشعار کی کمی نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ فارسی میں بہتات ہے۔ انہیں میں سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں وہ اشعار جن کا رشک کے موضوع سے تعلق ہے خاص توجہ چاہتے ہیں۔ کیونکہ "رشک" مرزا کا خاص موضوع تھا۔ اردو میں بھی اس موضوع پر ان کے اشعار اپنا جواب نہیں رکھتے۔ فارسی میں زورِ قلم اور بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔

جانِ غالب تابِ گفتاری گمان داری ہنوز
سخت بیدردے کہ می پرسی ز ما احوالِ ما

خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتارم سوخت
منتے بر قدمِ راہ روانست مرا

سخن کوتہ مرا ہم دل بہ تقویٰ مائل است اما
ز ننگِ زاہدا فتادم بکافر ماجرائیہا

بیچوں بقاصد بسپرم پیغام را
رشک نگذارد کہ گویم نام را

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

خوشنودیٔ غالب نبود زیں ہمہ گفتن
یکبار بفرمائے کہ اے ہیچکس ما

ہمانا گرم است بزم از جلوۂ ساقی کہ پنداری
گداز جوہرِ نظارہ در جام ست مینا را

بخلوت مژدۂ نزدیکیٔ یار ست پہلو را
زرشکِ امتحانِ یک بکس زی دادہ ام او را

بتو ہنشیند بہ محفل بجز راہم درد دل تنگش
کہ رنجد غیر از و چوں بے سبب درہم کشد او را

بادہ اگر بود حرام بذلہ خلاف شرع نیست / دل نہ نہی بہ خوب ما طعنہ مزن بہ زشتِ ما

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار / نیست گر صبح بہاری شبِ ماہے دریاب

از مژہ بن موچکیدۂ خوں باز کشادم / آرائش بستر ز شفق می کنم امشب

بہ رشک ما بکشیم رحم کہ یک عمر گناہ / ہم بہ تاراج سبکدستی بخشودن نیست

آمد از رہ غرور بوسہ بخلوتم نداد / رفت و در انجمن ز غیر فردِ تواگری گرفت

جادہ شناس کوئے خصم بودم و دوست راہ جوے / منکر ذوق ہمرہی خردہ بر رہبری گرفت

نظر فروز ادا ہا بہ دشمن ارزانی / بہ من سپار اگر داغ سینہ تابے ہست

رشک آیدم بہ روشنی دیدہ ہائے خلق / دانستہ ام کہ از اثر گرد راہ کیست

با من بجواب ناز و من از رشک بدگماں / تا عرصۂ خیال عدو جلوہ گاہ کیست

تلخ ست تلخ رشک تمنائے خوشیتن / شادم کہ دل ز وصل تو نومید بودہ است

بے پردہ شو ز فتنہ و الزام دہ مرا
گفتم کہ گل خوش ست بہ گلشن درین چہ بحث

ہائے این بیچہ کہ با جیب کشاکش دارد / بود با دامن پاکت چہ قدر ہا گستاخ

شباب و زہد چہ ناقدردانی ہمتیت / بلا بجان جوانان پارسا ریزد

می رمی از من و خلقے بگمانست ز تو / بیجا باش و بنشیں کہ گماں برخیزد

چہ عیش از وعدہ چوں باور ز غمو نم نمی آید / بخوئے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

خیز و در ماتمِ ما سرمہ فروشوئی ز چشم / وقت مشاطگی حسن خدا داد آمد

پیمانہ براں رند حرام ست کہ غالب / در بیخودی اندازۂ گفتار نداند

ہست لذّت و بسے ہم ز لب تا بنبید / لذّت دیگر دہد بوسہ چو دشنام شد

مے بہ زہاد مکن عرض کہ این جوہر ناب / پیش این قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد

بوسم لب دلدار و گرہ بدین نخوانم / نرم ست دلم حوصلۂ کام ندارد

اندراں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گذشت / کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

بخشم ناسزا می گوید و از لطف گفت رشک
گماں دارم کہ حرف دلنشینے بعد ازیں گوید

بدیں قدر کہ بہ ترکی و من بسکم / تراز بادۂ نوشیں چہ مایہ کم گردد

نخوت نگر کہ می خلد اندر دلش ز رشک / حرفے کہ در پرستشِ معبود می رود

ز رشکست اینکہ در عشق آرزوئے مردنم باشد / تو جانِ عالمے حیفست گر جان در تنم باشد

کم درد ز رشکست اینکہ غمخواری نمی خواہم / کہ ترسم یار با او را ہر کہ از حالم خبر گردد

بیروں میا ز خانہ بہ ہنگام نیمروز / رشک آیدم کہ سایہ بپا بوسی رود

چو رہ بقصد نشان بر کمان بجنباند / تپید ز رشک دلم تا نشاں بجنباند

خارہا در رہ سوداز دگاں خواہد ریخت / ورنہ در کوہ و بیاباں بچہ کار ست بہار

جان می دہم از رشک بشمشیر چہ حاجت / سر پنجہ بدامن زن و دامن بہ کمر بہ

از ذوق میان تو شدن سر بسر آغوش / بیہم فن ماست بہ زنار میاموز

لختے از مشق بر جا در کتابے بنگری / بر کنار آں ورق جانہا فدائیش می نویس

نیست معبودش حریف تاب ناز آوردنش
پیش آتش دیدہ ام روزے نیاز آوردنش
تا خود از بہر شاد کیست می میرم ز رشک
خضر و چندیں کوشش و عمر دراز آوردنش

سعی در مرگ رقیباں گراں جان کردی / می شناسم کہ چہ از ناز و دا گشتن تلخ

رنگ و بو بود ترا برگ و نوا بود مرا / رنگ و بو گشت ہمی برگ و نوا گشت تلف

دیدم از وصف رخت گل را شرر در پیرہن / آتش رشکم بجان تو بہار افتادہ ام

چہ پرسی کز لبت وقت قدح نوشی چہ میخواہم
ہمیں بوسیدنی چوں مست تر گردی مکیدن ہم

تو سرکشم داری عجز ز رشک نپسندم / سینہ می از گرمی تابۂ سمندر کن

جنون رشک را نازم کہ چوں قاصد رواں گردد / دوم در پیش و گیرم نامہ اندر راہ از دے

رشک نبود گر خدنگت جانبِ دشمن گرفت / درد ما ساطور پنہانی ست زخم کاریے

دلم میخونی و از رشک می میرم کہ در مستی / چرا زاں گوشۂ ابرو اشارت کامیاب ستے

جیسا کہ کہا گیا یہ صحیح ہے کہ مرزا ایرانی نہ تھے۔ فارسی ان کی مادری زبان نہ تھی، انھیں شیراز و اصفہان جانے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن ان کا یہ دعویٰ بھی غلط نہیں تھا کہ مبداء فیاض نے انھیں فارسی کا ذوق ازل میں بخشا تھا کیونکہ اس کے بغیر زبان و بیان کی لطافتوں کی ان منزلوں سے گزرنا آسان نہ تھا جن سے غالب گزرتے ہیں کامیاب ہوئے۔ ذوق کے اختلاف اور اندازِ نظر کے فرق کی وجہ سے ان کا مقابلہ شاید خالص ایرانی غزل گویوں مثلاً سعدی، حافظ، خواجو کرمانی، عراقی، جامی وغیرہ سے نہ کیا جا سکے لیکن ہندوستان کے اہم ترین فارسی شعراء مثلاً خسرو، ظہوری، نظیری، عرفی اور بیدل کے ساتھ ان کا نام نہ لینا ناممکن ہے۔ یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

شمس غازی آبادی

تاج محل

اے تاج محل یادگہِ عشق و امارت
ہرگز کہ تو شہپارۂ اربابِ دوَل ہے
لیکن ترے آغوش مناظر ہیں بہر نوع
تدریسِ محبت کا ہر اک باب اُٹل ہے

ہر دل ہے یہاں ولولۂ شوق سے معمور
ہر آنکھ مکافاتِ محبت کی طلبگار
صورت گرِ آئینِ وفا نخوتِ خود بیں
اظہارِ تمنا پہ نہیں عشق گنہگار

تقدیسِ محبت کا لئے پرچمِ نوری
پاکیزگیٔ حسن کے انداز سموئے
تو ایسے کھڑا ہے کہ برہوگن کوئی جیسے
دریا کے کنارے ہو سفینے کو ڈبوئے

یا پھر کوئی جوگن کہ لئے بربطِ صدتار
ہر تار کی جھنکار پہ پی بول رہی ہو
یا کوئی پری سوئے فلک مائلِ پرواز
یا پھول پہ تتلی ہے کہ پر تول رہی ہو

یا برسرِ نیلام کوئی جانِ تماشہ
اپنے ہی تماشے کی جھلک دیکھ نہ پائے
دنیائے ہوسناک سے سہمی کسی جانب
تکتی ہو کچھ ایسے کہ خریدار نہ آئے

یا شمع فروزاں ہے کہ فانوس سے باہر
یا پھر شبِ مہتاب ہے پتھرائی ہوئی سی
یا پھر کسی دولہا کا درخشندہ مکٹ ہے
یا پھر کوئی بیت ہے کہ گھبرائی ہوئی سی

یا پھر کوئی فانوس فضاؤں میں معلق
یا قوسِ قزح میں کوئی لٹکا ہوا جھولا
یا پھر کہیں انوار کی سمٹی سی فضا میں
یا اوجِ سماوات سے تاروں کا بگولا

یا پھر کوئی زاہد ہے کہ باندھے ہوئے احرام
یا پھر بتِ سیمیں کا ابھرتا ہوا جوبن
یا نقرئی کرنوں میں دمکتا ہوا ہیرا
یا چاند ستاروں کا نکھرتا ہوا جوبن

یا چشمِ حیادار سے ڈھلکا ہوا آنسو
یا کاہکشاں سے کوئی ٹوٹا ہُوا تارا
یا برگِ گُلِ تر پہ کوئی قطرۂ شبنم
یا ساغرِ بلّور میں ٹھہرا ہوا پارا

تبلیغِ محبت کا عمامہ ہے ترے سر
تو پیکرِ تسلیم و رضا روحِ وفا ہے
بھردیا ہے ہر دل میں محبت کے شرارے
خاموشی سے تو نے بھی عجب کام لیا ہے

حیرت ہے کہ کچھ لوگ تجھے دیتے ہیں الزام
یہ ان کے نئے طرزِ تخیّل کی عطا ہے
حالانکہ حقیقت میں امارت کا یہ مصرف
تہذیب کے چہرے کے لئے نورِ تمدا ہے

ہے مستیٔ صد شوق تری دید سے حاصل
انوار کی لہروں پہ صبو دوڑ رہا ہے
کیا جانیے وہ کون سے دل دفن ہیں تجھ میں
پتھر کی رگوں میں بھی لہو دوڑ رہا ہے

عرفانِ محبت میں ہے تفریقِ دوئی کفر
آوازۂ لیلیٰ پہ بھی مجنوں کا گماں ہے
تانیث ہے تذکیر کے پہلو سے نمایاں
ممتاز محل ہو کے بھی تو شاہ جہاں ہے

کس چیز سے تشبیہ دوں کیا کیا تجھے کہہ دوں
جتنا بھی ترے حسن کی تعریف ہو کم ہے
اے موسیٔ عمرانِ وطن کے یدِ بیضا
تو واقعی دنیائے محبت کا حرم ہے

ماجد سلمان

غزل

کیفیتِ الم بھی ہے ذوقِ نشاطِ کار بھی
زیست بقدرِ ظرف ہے جبر بھی اختیار بھی

ساقیٔ مہرباں من! بھیج کوئی بادۂ کہن!
عشق کو راس آ گئی تلخیٔ روزگار بھی

اب میری بے نیازیاں پہونچی ہیں دیکھئے کہاں
خاطرِ دل پہ ہے گراں نکہتِ زلفِ یار بھی

شاہدِ بزم دلبراں پھر اُٹھے نازکی کماں
ملنے لگا ہے کچھ سکوں عشق کو زیرِ دار بھی

کشمکشِ حیات میں نشۂ مے کا ذکر کیا
دل کو سکوں نہ دے سکا لطفِ نگاہِ یار بھی

پوچھ رہے ہو اس سے کیا لالہ و گل کی داستاں
بھولا نہیں جو آج تک لذتِ نوکِ خار بھی

شام ہے شام بے سحر نالہ ہے وہ بھی بے اثر
آہ! بگڑ گئی ہے کیا گردشِ روزگار بھی

پہلے اک آسرا بھی تھا اب کوئی آسرا نہیں
تم تو بجھا کے چل دئے شعلۂ انتظار بھی

اس دلِ غم پرست کا کوئی مزاج داں ہو کیا
وجہِ ملال بن گئی پرسشِ چشمِ یار بھی

فرخ جلالی

ہوش بدایونی کے نام غالب کا ایک غیر معروف خط

غالب کے خطوط اُن کی زندگی کی سچی تصویریں ہیں ان کے تفکر آمیز شعروں میں جو اشکال اور حسن ہے وہ مکاتیب میں شوخی اور سادگی سے بدل جاتا ہے۔ یہاں پُر پیچ راہیں نہیں ہیں سیدھے راستے ہیں۔ اس لئے غالب کے خطوط کی دستیابی اُن کے ذہن کے گوشوں کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ محققینِ غالب کی کوششوں کے باوجود خطوط کی بڑی تعداد ابھی بکھری ہوئی ہے۔ غالب کے ایک شاگرد خان بہادر منشی محمد سخاوت حسین مدہوش انصاری بدایونی کے نام ایک خط ملا ہے۔ جو عودِ ہندی اور اردوئے معلی میں شامل نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ رقعہ خطوطِ غالب مرتبہ مولانا مہر میں بھی شامل نہیں ہے۔ کچھ وجوہ کی بنا پر مکرمی مالک رام صاحب کی تالیف 'تلامذۂ غالب' میں جناب مدہوش کے حالات درج نہ ہو سکے۔ مگر ان کا نام 'تلامذۂ غالب' میں صفحہ ۵۰۲ پر لکھا ہے۔ یہاں ہم ان کے مختصر حالات پیش کرتے ہیں۔

جناب محمد سخاوت حسین انصاری بدایوں کے رہنے والے تھے۔ مدہوش تخلص تھا۔ آپ کے دادا حضرت میاں جی عبدالملک انصاری تیرھویں صدی ہجری کے مشہور بزرگوں میں سے تھے۔ ۱۲۵۸ھ میں انتقال ہوا۔ آپ حضرت شمس الدین ابوالفضل سید شاہ آل احمد صاحب اچھے میاں[1] مارہروی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بڑے صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ اکثر طلباء کو درس بھی دیتے تھے۔ شیخ محمد رضی الدین بسمل نے اپنی تالیف تذکرۃ الواصلین میں صفحہ ۲۳۴ پر لکھا ہے:-

" آپ کے تین صاحبزادے تھے۔ ایک امان اللہ حسین عرف

---

[1] حضرت اچھے میاں ۲۸ رمضان ۱۱۶۰ھ کو مارہرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ سلسلہ عالیہ قادریہ کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ آپ کے خلفاء میں بڑے بڑے مشاہیر شامل تھے۔ حضرت

خلیفہ تلو اور میاں امداد حسین و شیخ محمد عنایت حسین مرحوم اُن کے پوتے میرے دوست خان بہادر محمد سخاوت حسین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں۔"

مولوی محمد سخاوت حسین انصاری کے ایک لڑکا تھا۔ اس کا انتقال چھوٹی عمر میں ہو گیا تھا۔ ایک بیٹی تھیں جنہیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ جناب مدہوش کے نواسے مختلف ممالک میں ممتاز عہدوں پر ملازم ہیں بڑے نواسے الحاج حامد سعید خاں لودی بی۔ اے (علیگ) یو۔ این۔ او کی طرف سے ایران میں ماہر خوراک و زراعت کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ دو نواسے پاکستان میں ممتاز عہدوں پر فائز ہیں ان کے ایک نواسے جناب عابد سعید خاں فنا لودی بی۔ اے (علیگ) ہندوستان میں ریٹائرڈ ہیں۔ فانی بدایونی اور دوسرے شعراء سے سلسلۂ تلمذ ہے اہلِ سخن کے قدردان ہیں اور بہت خوب شعر کہتے ہیں۔ احباب کے اصرار پر ایک مختصر مجموعۂ کلام " زنگار رنگ " نظامی پریس بدایوں سے طبع ہو چکا ہے۔ مکرمی فنا صاحب فرماتے ہیں کہ اپنی بھتیجی بیٹی کو غالب کا ایک شعر یاد کرنے پر ایک اشرفی انعام میں دیا کرتے تھے تقریباً اسی برس کی عمر میں ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔

تعلیم کے سلسلے میں اساتذہ کا حال کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوا۔ تذکرۃ الواصلین کی تقریظ لکھتے ہوئے جناب مدہوش فرماتے ہیں۔

" اس کتاب کے مؤلف میرے شفیق مولوی محمد رضی الدین المتخلص بہ بسمل بدایوں میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت پائی

"چوں کہ قدرتی طور پر ذہانت و قابلیت تھی اپنے ہم چشموں میں
ہمیشہ باوقار رہے ان کا طرز عمل شریفانہ اور عادات مقبول عام
ہیں زہد و اتقا اُن کا حصہ ہے مگر یہ سب کچھ میرے معظم و
مکرم اُستاد اُن کے والد ماجد حکیم مولوی محمد سعید الدین[1] صاحب
مرحوم و مغفور کا فیض و برکت ہے۔"

مدہوش بدایونی کی عمر کا بڑا حصہ شاہجہان پور میں گذرا وہیں وکیل عدالت دیوانی تھے۔ شاہجہانپور کی پبلک زندگی میں بڑا نام پایا۔ وہاں آنریری مجسٹریٹ اور میونسپلٹی کے وائس چیئرمین بھی رہے۔ اپنے زمانے کی قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سر سید کو جب جدید تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے قوم کے اکابر سے مشورے طلب کئے تو مشاہیر نے اس موضوع پر رسائل لکھے۔ سر سید نے ان رسالوں کے خلاصے ۱۲ مئی ۱۸۷۲ء میں میڈیکل ہال پریس بنارس سے مجلس خازن البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ العلوم للمسلمین کی طرف سے چھاپے اس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا بیج بنارس میں پڑا اور علی گڑھ میں بار آور ہوا یوں کعبہ سے بتوں کو دُور کی نسبت ہوئی۔ اس کتاب میں سر سید لکھتے ہیں کہ وہ (محمد سخاوت حسین مدہوش) نصیبت تعلیم اس طرح پر چاہتے ہیں۔

"اولاً لکھنا پڑھنا سیکھنا و پھر علم حفظ صحت بدنی اور
نفع نقصان اشیاء خوردنی و نوشیدنی اور تہذیب اخلاق دینی
اور خدمت ماں باپ بھائی بند محبت عزیز و بیگانہ اور صحبت ساتھ
دوست و آشنا برتاؤ ساتھ حاکمان حقیقی و مجازی کے احکام و
اوامر بادشاہ حقیقی و مجازی کے اور تحریر و تقریر مافی الضمیر کے
دوسرے کے اور آپ کو بخوبی آجاوے۔"

تعلیم کا یہ نظریہ زندگی کے اہم شعبوں پر بڑی حد تک حاوی ہے اور اپنے زمانہ کے رجحانات کا عکس بھی ہے۔ اس کے علاوہ وہ دیگر ملکی تحریکات میں بھی حصہ لیتے رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے بار بار "ہم" فرماتے تھے۔ اس پر ایک صاحب نے فرمایا لفظ "ہم" سے آپ کی مراد 'ہ' سے ہندو اور 'م' سے مسلمان ہے۔ اس نکتہ کو بہت سراہا گیا۔
تصانیف اور تالیفات میں رسالہ تعلیم مسلمانان اور رقعات مدہوش کا پتہ چلا ہے۔ "تذکرہ الواصلین" کی تقریظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شگفتہ نثر لکھتے تھے اور اشعار کا استعمال برمحل کرتے تھے۔ کلام دستیاب نہیں ہوا۔ مکرمی جناب مولوی محمد سلیمان صاحب بدایونی فرماتے ہیں کہ بہت وجیہہ اور خوبصورت تھے، طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔

غالب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور خط کا جواب برابر دیتے تھے۔ اسلامیہ کالج میگزین بدایوں، "جدید شعرائے بدایوں نمبر" مرتبہ فرخ جلالی و قمر قرشودی، "تلامذۂ غالب" از مالک رام، "رنگارنگ" از فنا لودی بدایونی میں غالب سے تلمذ کا ذکر موجود ہے۔ اس کے علاوہ مولوی مہیش پرشاد کے کاغذات میں بھی بحیثیت تلمیذ غالب ذکر موجود ہے۔ رسالہ ہردل عزیز منشور سراج سخن شاہجہان پور کے فروری ۱۹۲۳ء کے پرچہ میں لکھا گیا ہے۔

"چوں کہ افتخار نامہ عالی حضرت غالب دہلوی مرحوم و
مغفور کا اندراج کتب عود ہندی اور اردوئے معلیٰ میں رہ
گیا تھا لہذا بطور یادگار درج ہے۔"

غالب کا خط جناب محمد سخاوت حسین مدہوش کے نام

"مشفقی مکرمی منشی سخاوت حسین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ
سبحان اللہ آپ کے خط کا جواب نہ لکھوں اپنے کو تقصیر
کروں اگر شتاب نہ لکھوں اس وقت ڈاک کے ہرکارے نے
تمہارا خط دیا۔ ادھر پڑھا اُدھر جواب لکھنے کا قصد کیا۔ میں
ایک شخص گوشہ نشیں فلک زدہ اندوہگیں نہ اہل دنیا نہ اہل دین
مجھ سے نکمّے آدمی کا جو کوئی مشتاق ہو اس کے خط کا لکھنا کیوں
مجھ پر شاق ہو۔ ظاہرا تم خود مجمع حسن اخلاق ہو ورنہ کیوں تم کو
میرا اس قدر اشتیاق ہوتا۔ ہاں ایک بڑی بھلی شاعری اُس کا
حال یہ ہے کہ آگے جو کچھ کہا سو کہا اب شاعری رہا بہرحال
تمہاری فقیر نوازی کا شکر گذار اور طالب دیدار ہوں۔
نجات کا طالب
غالب
چاشتگاہ دوشنبہ ۴ فروری

[غالب کا یہ غیر معروف خط عزیزی گرامی ویریندر پرشاد سکسینہ کی عنایت سے دستیاب ہوا اور اُن کے شکریہ سے شائع کیا جاتا ہے]

---

[1] حکیم محمد سعید الدین کامل زین العابدین خاں عارف کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں حصہ لیا۔ ۱۳۱۶ھ میں انتقال کیا۔